راجندر سنگھ بیدی

جوگیا





JOGIYA : LOVE STORIES
RAJENDER SINGH BEDI

قیمت ایک روپیہ

فہرس

{کوہِ نور پرنٹنگ پریس، دہلی}

ٹکی

"۱۶ ؟"

"جی ہاں — ۱۶، تیسری قطار میں۔" ٹکی نے ایک ہاتھ سے اپنے بالوں کو دباتے ہوئے کہا: "آپ کو زحمت اٹھانے کی نوبت ہی نہ آئے گی صاحب، کنڈکٹر آپ کی مدد کرے گا۔"

"شکریہ، شکریہ،" کہتے ہوئے نوجوان مسکرایا اور مسکراتے ہوئے اس نے ایک اور چونّی کونٹر پر رکھ دی۔ چونی جیب میں ڈالتے ہوئے ٹکی نے آنکھیں بند کرلیں جیسے اس کا دماغ بہت تھک گیا ہو۔ وہ دن بھر کلکتہ کی ایک بیمہ کمپنی میں ٹائپ کیا کرتی تھی اور رات کو اس عظیم الشان سنیما میں ٹکٹیں بیچا کرتی تھی۔ تھوڑی سی تنخواہ کے علاوہ کسی رنگین مزاج نوجوان کے لئے کسی لڑکی کے پہلو میں سیٹ بک کر دینے کے عوض اسے چونی زیادہ ملتی تھی اور اس کی آمدنی پر ایک بڑا کنبہ پل رہا تھا۔ ایک بوڑھی، ہٹیلی ماں تھی جو کھانا ملنے میں ذرا سی دیر ہو جانے پر اپنا منہ آپ ہی نوچ لیتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بیوہ بہن تھی جسے اس کے خاوند نے بیوگی سے دو برس پہلے محض اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ آگ جلانے سے پہلے وہ

تمام گھر میں دھواں بھر دیتی تھی، اور پھر چھوٹے بھائی تھے اور بھا بجے۔۔۔۔۔۔
کچھ دیر بعد موٹے کی سی سبک رفتاری کے ساتھ وہی نوجوان کونٹر کی طرف آیا اور آتے ہی اس نے اپنی انگلیاں لکڑی کی کونٹر پر بجائیں اور بولا "لیکن مام ــــ وہاں تو کوئی لڑکی نہیں۔"
بچی نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا "کہیں باہر ہوگی صاحب۔۔۔ اس نے مجھ سے ٹکٹ خریدا ہے۔ میں ڈرتی ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔"
"اُف"! نوجوان نے بیزاری سے کہا۔ ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے مس ــــ مام ہمیشہ ایسا ہی تو ہوتا ہے۔"
پھر وہ لڑکا کچھ دور جا کر ساگوان کے خوب صورت چوکھٹوں میں لگے ہوئے سٹلز کو دیکھنے لگا اور ایک اضطراب کے عالم میں اس نے "آج شب کو" سرخ لیبل پھاڑنے شروع کر دیئے۔ پھر بچی کے پاس لوٹتے ہوئے بولا "مایوسی سے تو انتظار اچھا ہے۔"
بچی نے اس بے صبر نوجوان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور دل ہی دل میں اس کے خوب صورت بالوں کو سراہنے لگی۔ کتنے اچھے ہیں اس کے بال، دولت اور فکر میں گھرے ہوئے سیٹھوں کی طرح وہ گنجا نہیں، نہ ہی توندیلا ہے اور نہ دبلا۔ بس ۔۔۔ ٹھیک ہے، اور اس کے بال دھان کے ان کھیتوں کی طرح ہیں جنہوں نے مون سون ہواؤں سے پورا فائدہ اٹھایا ہو۔ اس کی وضع قطع اور باتوں سے شراب کی بو آتی ہے حالانکہ شاید اس نے شراب نہیں پی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ جوان ہے، جیسے انگور پک جاتے ہیں تو ان سے شراب کی بو آنے لگتی ہے۔
کچھ دیر بعد وہ لڑکا پردے اٹھا کر بڑے غور سے سینما کی چھت کا معائنہ کرنے لگا۔ چھت میں مصنوعی ستارے چمک رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جب سینما میں روشنی گل ہو جائے گی تو یہ ستارے اور زیادہ چمکنے لگیں گے اور بہت خوبصورت دکھائی

دیں گے۔ چھت کی طرف نظریں اٹھانے سے آسمان کا دھوکا ہو گا اور وہ یقیناً اس منظر کو پسند کرے گا اور اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو کہے گا ـــ ستارے کتنے خوبصورت ہیں، اور . . . . . . اور یہ سچ ہے کہ اس نے تاروں بھرے آسمان پر کبھی نگاہ بھی نہیں دوڑائی تھی، اور نہ قدرت کے اس کلکتہ کو جو کہ ہر روز رات کو آسمان پر دکھائی دیتا تھا، پسند کیا تھا۔ لیکن چھت پر چمکتے ہوئے ستاروں کو تو وہ اس لئے پسند کرتا تھا کہ ان پر سچ مچ کے ستاروں کا دھوکا ہوتا تھا اور اور انسان ہمیشہ اصلیت کی نسبت اس دھوکے کو پسند کرتا ہے۔

پھر وہ نوجوان برآمدے میں ایک دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ بچی کو یقین تھا کہ وہ اس بے فکرے نوجوان کو پسند نہیں کر سکتی، البتہ بڑی ہی آسانی سے نفرت کر سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت رحم دل تھی اور شاید اسی لئے وہ اس کے متعلق اپنے تخیل کو محبت کی آلودگی سے علیحدہ رکھنا چاہتی تھی، ورنہ اس کے لئے یہ کس قدر آسان تھا کہ شو کے شروع ہو جانے پر بکنگ آفس کے سامنے ہاؤس فل کا بورڈ لگا کر اس نوجوان کے ساتھ کی کسی سیٹ پر خود جا بیٹھتی۔ برآمدے کی دیوار پر نیا نیا پالش ہوا تھا، اس لئے نوجوان کے کپڑے کسی قدر آلودہ ہو گئے لیکن پرے ہٹ کر اس نے پھر اپنی انگلی سے دیوار کو چھوا، گویا کپڑوں کے آلودہ ہو جانے سے اسے دیوار کے نئے پالش کئے جانے کا یقین ہی نہ آتا ہو۔ پھر اس نے آوارہ نگاہوں سے سینما کی گھڑی کی طرف دیکھا جو دائیں دیوار سے ہٹا کر مینجر کے کمرے کے اوپر لگا دی گئی تھی۔ اس نے گھڑی کو اپنی اصلی جگہ پر دیکھ کر پھر اسی جگہ کو دیکھا جہاں سے وہ اٹھائی گئی تھی۔ بچی سوچنے لگی۔ انسان کی عادت بھی عجیب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک چیز اس جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ منتقل کر دی گئی ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کیوں ایک بار پھر اس

جگہ کو دیکھتا ہے جہاں سے وہ چیز اٹھالی گئی ہو۔ گویا اس کا ادراک اس تبدیلی کو یک بیک قبول نہیں کرتا اور شاید اسی لئے اسے ۲۴ پرگنہ کے دیہات میں گذارے ہوئے زندگی کے دن بار بار یاد آتے تھے۔ وہ دن جب کہ وہ تہذیب سے دور، دادا کے ہاں آرام و سکون کی زندگی بسر کرتی تھی۔ لیکن اب ۔۔۔۔۔ کلکتہ کے سے مہذب شہر میں زندگی کے معیار کو قائم رکھنے کے لئے اسے کیا کچھ کرنا پڑتا تھا۔

بکی نے اپنے سامنے پڑے ہوئے سیٹوں کے پلین پر نظر دوڑانی شروع کی۔ آخر ایسے ہی بے صبر نوجوان کو کسی لڑکی کے پہلو میں جگہ دینے سے اسے چونی ملتی تھی۔ اس کی انگلی نقشے میں خالی نشستوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ دور نوجوان کو بکی کے ناخنوں پر گلابی پالش چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور وہ نوجوان گھور گھور کر اس چمکتے ہوئے پالش کو دیکھنے لگا۔ جیسے اسے ان کے پالش ہونے میں یقین نہ آتا ہو اور وہ ان ناخنوں کو چھو کر دیکھنا چاہتا ہو ۔۔۔۔

چھبیس ۔۔۔۔ ستائیس ۔۔۔۔ تیس۔ چوتھی قطار ۔۔۔۔ بارہ ۔۔۔۔

—— بکی کی نگاہیں ایک سیٹ پر جا رکیں۔ وہ شاید اس سیٹ پر نشان لگانا بھول گئی تھی۔ اس سیٹ کے لئے بھی تو ایک لڑکی نے ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ اس لڑکی کو جانتی بھی تھی —— مسز دسوزا ۔۔۔۔ خاہ! اس کے ساتھ مسٹر دسوزا نہیں تھے، وہ تھے یا نہیں تھے، بکی ہلکی ہلکی سردرد میں بالکل بھول چکی تھی۔ اسے تو ان کی شکل تک یاد نہ رہی تھی۔ بکی نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر زور ڈالنا شروع کیا حتیٰ کہ وہ اس چونی کو کوسنے لگی جو اسے اس کام کے لئے ملتی تھی۔

"جنٹلمین،" بکی نے اس نوجوان کو بلاتے ہوئے کہا: "میں نے آپ کی

سیٹ چوتھی لائن میں تیرہ پر رکھی ہے اور بارہ پرمس وسوزا کی جگہ ہے۔ بجی نے جان بوجھ کر مسز کو مس کہا۔ آخر قدرت نے عورت کے ماتھے پر تو ایسی تخصیص کا کوئی نشان نہیں رکھا، اور پھر بجی کو اپنی جوانی عزیز تھی، اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور اپنی بہن پر اسے بہت ترس آتا تھا۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ نوجوان نے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا "شکریہ" اور ہال کے اندر داخل ہو گیا۔

بجی نے ایک سگریٹ سلگایا اور پھر بلین کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ جب وہ ایش ٹرے کو اپنے نزدیک سرکا رہی تھی تو ایک بدصورت سا لڑکا آیا اور اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بجی غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ابھی کم سن تھا، اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا، البتہ جاننا چاہتا تھا۔ ماں اور بہن کے علاوہ اس نے دنیا میں کوئی عورت نہیں دیکھی تھی اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی شرم کے پیچھے ایک شدید سا ڈر دکھائی دے رہا تھا جو کہ اس کے چہرے کے بھدے نقوش کو اور بھدا بنا رہا تھا۔

لڑکے نے ٹکٹ کے پیسوں کے علاوہ ایک اور چونی بجی کی طرف سرکا دی۔ بجی کا منہ کھلا رہ گیا "تم چاہتے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ بولی اور چونی کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے اس نے جیب میں رکھا اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے بلین پر جھک گئی۔ ہاؤس فل تھا صرف سولہ نمبر کی نشست خالی تھی۔ وہی نشست جو اس نے خوب صورت نوجوان کے لئے پہلے بک کی تھی لیکن ساتھ کی سیٹ پر لڑکی نہ ہونے سے خالی رہ گئی تھی۔ بجی نے سوچا اب وہ لڑکی ضرور آ بیٹھی ہو گی۔ کتنی خوب صورت تھی وہ لڑکی ـــــ وہ بلانڈ، اور

اس کے بالوں کی لہریں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے دھان کے کھیت پر سے ہوا سرسراتی ہوئی گذر رہی ہو۔۔۔۔ شاید اس نے بال کسی نوجوان کی توجہ کو کھینچنے کے لئے بنائے تھے۔ اس کے پہلو میں اس بے وقوف، بدصورت چھوکرے کو جگہ دینا اس لڑکی کی توہین کرنا تھا اور یہ چھوکرا نوآموز ہی نہیں تھا بلکہ بالکل دیہاتی تھا۔ ۲۴ پرگنہ کی طرف کا رہنے والا ہی تو دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ نہ تو وہ چھت کے ستاروں کی تعریف سے سلسلہ کلام شروع کر سکتا ہے اور نہ ہی اس لڑکی کے بالوں کو دھان کے کھیت سے تشبیہ دے سکتا ہے۔ وہ گدھا تو اصلی ستاروں کو پسند کرتا تھا اور کہیں سے دھان کاٹنا اکٹھا کر کلکتہ چلا آیا تھا۔

نوجوانوں کا ایک غول اس کی طرف بڑھا آرہا تھا لیکن نشستیں رک چکی تھیں۔ پلین سارے کا سارا بچی کے ہاتھ سے لگائے ہوئے نشانوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو بتا دیا کہ اب اس درجہ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ نوجوان اپنے اوور کوٹ تھامے اور پتلون کے پائنچے اٹھائے واپس چلے گئے۔

آسمان سے ننھی ننھی بوندا باندی ہونے پر سینما کے برآمدے پناہ گاہ بن گئے تھے۔ اس کے بعد مون سون کے بڑے بڑے بارانی ریلے آنے لگے اور چند چھوکریاں اپنے گون سنبھالتی ہوئی سینما کی ایجنٹ کی طرف آکھڑی ہوئیں ان لڑکیوں کے ریلے دروازے کی طرف دھکیل دیئے جاتے تھے اور ان بارانی ریلوں سے وہ ریلے زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔

اس وقت بچی کے سامنے اس دیہاتی نوجوان کے لئے ایک عجیب مادرانہ جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے اپنے کمرے کے سامنے 'ہاؤس فل' کا تختہ' لٹکا دیا اور خود کھڑکی

بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔ اس چھوکرے کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ٹکٹ دیدیا اور پھر خود اسے کنڈکٹر تک لے گئی۔ مسلسل کانپتے رہنے سے اس چھوکرے کی بدصورتی کے حسن میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ کنڈکٹر نے احتیاط سے اس نوجوان کو سولہ نمبر کی نشست پر بٹھا دیا۔ بجی دروازے میں کھڑی اس چھوکرے اور اس کی رفیقہ کی طرف دیکھتی رہی۔ بلانڈ نے گھبراکر اپنی دائیں طرف دیکھا اور مضبوطی سے اپنی کرسی کی سلاخوں کو پکڑ لیا۔ اس لڑکی کو اپنی شام کے تباہ ہوجانے میں کوئی شک نہ رہا۔ بجی نے سوچا شاید وہ لڑکی بھی میری طرح ربط حسن کی بجائے اپنی جونی یا دس کے نوٹ کو پسند کرتی ہو۔ اس کے بعد پردے چھٹ گئے اور سینما شروع ہوا۔ انگریزی فلم ــــ "میرا نام مجھ سے پہلے سفر کرتا ہے"۔ شروع ہوئی اور گانا ایک دلفریب ٹیون پر گایا جانے لگا ــــ

تاروں بھری رات کے نیچے

بجی نے ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا اور اپنے دل میں ٹیون کو گنگنانے لگی۔ تاروں بھری رات کے نیچے، لیکن ابھی دوسرے شو کا ہلین بنانا تھا اور اسے تین ساڑھے تین روپے ہاتھ لگ چکے تھے۔ اب تو وہ بہت ہی تھک گئی تھی، اپنی آنکھوں کو شدت کی روشنی سے بچانے کے لئے اسے ہال کا اندھیرا پسند تھا وہ سوچنے لگی، تاروں بھری رات کے نیچے کا دل فریب گانا سن کر اس بدصورت نوجوان کو کیا خوب صورت ستاروں سے بھرا ہوا آسمان یاد آئے گا یا ہال کی چھت، یا خوبصورت نشستیں جہاں ہر روز ایک نیا تجربہ ہوتا ہے، اس کے بعد بجی باہر نکل آئی۔ کنڈکٹر جانتا تھا کہ بجی اسی جگہ کھڑی ہوکر لمحہ دو لمحہ کے لئے پکچر دیکھا کرتی ہے اور پھر فوراً ہی مضطرب ہوکر باہر نکل جاتی ہے۔ گویا پردہ سیمیں پر کوئی بہت ہی خوفناک منظر دکھایا جارہا ہو۔ حالاں کہ یہ بات نہ تھی۔ وہ سکون سے ایک گانا بھی نہیں سن

سکتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دل کا برتن چھوٹا ہے اور موسیقی کا ظرف بہت بڑا اور نغمہ اس کے چھوٹے سے دل میں نہیں سما سکتا۔ وہ اپنا چھلکتا ہوا دل لیکر باہر نکل آتی اور تاروں بھری رات کے نیچے ۲۴ پرگنہ کے کسی گاؤں کے تالاب کا کنارہ اسے یاد آجاتا، جہاں اس کی محبت پروان چڑھی اور لٹ گئی، جہاں سے ہندو عورتیں اپنا گھڑا بھر کر چلی آتی تھیں۔ اس سے زیادہ جگہ ان کے مٹکوں میں نہ تھی اور اس مٹکے کے پانی سے وہ کھانا بھی بناتی تھیں اور چوکا بھی کرتیں۔ گائے کے گوبر کو مٹی میں ملا کر وہ چوکے کو بڑی صفائی سے پوتا کرتیں اور بچی کا جی چاہتا تھا کہ ان بڑے بڑے شاندار ہوٹلوں کو چھوڑ کر کسی ایسے علیحدہ کونے میں صبر وسکون سے پڑ رہے اور ان ہی عورتوں کی طرح چارپائی پر لیٹ کر رات کو تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کا تماشا دیکھا کرے۔

وہ مینجر کے کمرے کے پاس کھڑی ہو کر سگریٹ سلگانے لگی، کچھ دیر بعد ہال میں روشنی ہو گئی۔ ہاف ٹائم ہو چکا تھا۔ بچی نے پھر ایک دفعہ پردوں کے پیچھے سے سولہ اور اس کے ساتھ کی نشست کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے لئے ویسے ہی اجنبی تھے اور اپنی اپنی جگہ پر سمٹ کر بیٹھے تھے۔ اگر وہ جھوکرا طریقے سے اس خوب صورت ٹیون کی تعریف کر دیتا تو کتنی اچھی بات ہوتی لیکن وہ تو گم سم بیٹھا تھا۔

اب ہاف ٹائم میں وہ کوئی بات شروع کر سکتا تھا لیکن وہ باہر چلا آیا اس کا چہرہ بہت اترا ہوا تھا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپکتا تھا اور اپنے لبوں پر بے تحاشہ زبان پھیرتا اور ان سب حرکتوں سے وہ بالکل ایک اجڈ دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔

"ہلو مس ——— مام۔" اس نے باہر نکل کر دوڑتے ہوئے کہا۔

بکی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بولی: "ہلو ـــــ بوائے، انجائیڈ آل رائیٹ دکھو، خوب لطف رہا نا؟"

اس لڑکے نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا: "مام ـــــ میں تو کلکتہ دیکھنا چاہتا ہوں اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔" اس کے بعد وہ ہکلاتے لگا: "میرا چچا کدار پور میں دکان کرتا ہے۔۔۔۔"

بکی کا جی چاہا کہ وہ صاف گوئی سے کام لیتی ہوئی کہہ دے کہ کلکتہ بالکل اس ہال کی چھت کا سا ہے۔ لیکن اس نوجوان نے چھت کو بغور دیکھا بھی نہیں تھا اور بکی بھی یک لخت پریشان اور اداس ہو گئی۔ اس کے سر میں زیادہ درد ہونے لگا۔ وہ اس دیہاتی نوجوان کو پسند کرنے لگی تھی۔ وہ بہت رحم دل تھی۔ اس کے بعد جب شو ختم ہوا تو بکی نے مینیجر سے چھٹی لے لی۔ اس وقت وہ دیہاتی بدصورت نوجوان باہر آیا۔ بکی اس کے قریب چلی گئی، بولی۔

"ہلو بوائے ـــــ تم کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"ہرش پور ـــــ ۲۴ پرگنہ کا۔"

"میں جانتی ہوں ہرش پور ـــــ میں ایک دفعہ مسٹر رے کے ہاں ایک ماہ ٹھہری تھی۔"

"رے؟ ہاں، ہاں۔" لڑکے کا چہرہ چمک اٹھا: "میں رے کو جانتا ہوں وہ ہمیں پڑھاتے رہے ہیں۔"

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر وہ لڑکا بولا: "آپ اتنی مہربان ہیں ـــــ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"نلنی۔" بکی بولی۔ "لیکن یہاں سب لوگ مجھے مارگریٹ کہتے ہیں۔ مسٹر رے کا بڑا بھائی میرا باپ تھا۔ اسے مرے ہوئے دس برس ہو چکے ہیں۔ انہوں نے

ایک اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کی، وہ لڑکی میری ماں ہے ... اور کیا تم کلکتہ دیکھنا چاہتا ہے"؟

چھوکرے نے سر ہلا دیا۔ مارگریٹ بولی "چلو ہم کافی کی ایک پیالی پئیں گے"۔ اور وہ دونوں فرپو کی طرف چل دیئے۔ ہوٹل کے دروازے پر دو بڑے بڑے دودھیا بلب دور سے چاند کی مانند دکھائی دیتے تھے، مارگریٹ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ــــ "دور سے اصلی چاند کا دھوکا ہوتا ہے"۔ نوجوان نے فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔ مارگریٹ ان بلبوں کی طرف اشارہ کر کے کہنا چاہتی تھی۔ بس کلکتہ ایسا ہی ہے۔

پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے اور کافی پینے لگے۔ اس نوجوان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے کافی کا تلخ ذائقہ پسند نہیں۔ وہ گنوار شاید دودھ کے مٹکے چڑھا جاتا تھا۔ کافی کے بعد مارگریٹ نے کئی چیزوں کا آرڈر دیا۔ لڑکے کو ان میں سے کئی چیزوں کے نام نہ آتے تھے۔ مارگریٹ پوچھتی ــــ

"یہ کیا ہے"؟

"نامعلوم"۔

"ساسیج ــــ کہو ساسیج"۔

"ساسیج"۔

"یہ کیا ہے"؟

"نامعلوم"۔

"کٹلٹس ــــ کہو کٹلٹس"۔

"کٹلٹس"۔

کبھی وہ لڑکا معصومانہ انداز سے کچھ اور کہہ دیتا تو مارگریٹ اسے

درست کرتی، جیسے بچپن میں ماں بچے کو نئے نام لینے سکھاتی ہے۔ اور جب وہ الٹا سیدھا نام لیتا ہے تو اسے درست کرتی ہے۔

کافی پینے اور کچھ کھا چکنے کے بعد مارگریٹ نے پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن اس لڑکے نے تھام لیا اور اپنی جیب سے پیسے نکال کر بل پر رکھ دیئے۔ مارگریٹ کا خیال تھا کہ کلکتہ میں عورت کا بل ادا کرنے کا اخلاق اس نوجوان کو نہ آتا ہوگا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ وہ اس بات سے تو واقف تھا، ایسے ہی جیسے سینما میں جونی زیادہ دیگر عورت کے ساتھ سیٹ بک کروا لینے کا طریقہ اسے کسی نے بتا دیا تھا۔ اسی طرح عورت کے ساتھ کافی پی کر یا کھانا کھا کر اس کے پیسے ادا کرنے کا اخلاق بھی کسی نے سکھا دیا ہوگا۔

مارگریٹ نے بتایا —— کلکتہ بہت مہذب ہو چکا ہے اور تہذیب بھی انگور کے دانوں کی طرح ہے، بہت پک جاتی ہے تو اس سے شراب کی بو آنے لگتی ہے اور جب مارگریٹ کو پتہ چلا کہ وہ لڑکا عورت کے متعلق بالکل کچھ نہیں جانتا تو اس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا :—

"بوائے، کیا تم آج شب میرے مہمان بنو گے؟ ...... میں آج اپنی ماں کے پاس نہیں جاؤں گی، یہاں گھر سے علیحدہ میرے پاس ایک بہت اچھا فلیٹ ہے ......

میں تمہیں بتا دوں گی عورت کیا چیز ہے۔ لیکن وہ عورت جس نے تمہیں سینما کے دروازے پر پایا، یا جسے تم نے ۲۴ پرگنہ میں دیکھا، یہاں تم اسے نہیں پا سکو گے ...... ہاں تم اس عورت کو دیکھ لوگے، جو کلکتہ ہے"!

ٹرمینس سے پرے

پنجاب میل چلی تو خاصی سست رفتاری سے پلیٹ فارم کے احاطے سے باہر نکلی۔ دیر تک موہن جام کو اپنی نازک سی بیوی سومترا کا بدن ایک سادہ سی ہینڈلوم کی ساری میں لپٹا ہوا نظر آتا رہا۔ سومترا کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑی تھی جب کہ موہن ایک سٹال کے برابر کھڑا آخر دم تک اپنا رومال ہلاتا رہا۔

گاڑی چلنے سے پہلے سومترا کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں، الفاظ ہمیشہ کی طرح بیکار ہو گئے تھے: "پیچھے گھر کا خیال رکھنا،" "ہوٹل کی روٹی مت کھانا،" "ہفتہ میں ایک — نہیں دو بار خط ضرور لکھنا۔" یہ سب باتیں آنکھوں کی زبان کے سامنے گونگی ہو گئی تھیں اور انہوں نے موہن جام ایسے آدمی کے دل کو بھی گداز کر دیا تھا۔ پھر بیوی الگ ہونے سے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی تائید سی مانگتی گئی ہے۔ اس وقت تو کوئی جھوٹ بھی بول دے، لیکن کچھ لوگ...... موہن نے کچھ نہ کہا۔ وہ پہلے تیز تیز اور پھر آہستہ آہستہ رومال ہلاتا رہا۔ یہ حرکت ایک رسم بن چکی تھی لیکن اچھی معلوم ہوتی تھی۔ دل کہاں، کیوں اور کس کے لئے دھڑک رہا ہے؟ یہ تو دکھائی نہیں دیتا، البتہ رومال نظروں

کے دھندلکے میں حل ہونے تک بڑا بڑا اس آدمی کو دکھائی دیتا رہتا ہے جو

جا رہا ہے۔

یہ سفر ہی بکواس ہیں تو جب بھی کہیں جانے لگتا ہوں میری طبیعت گری سی جاتی ہے۔ اسٹیشن پہ ہجوم محض ہجوم کی وجہ سے آدمی تنہا رہ جاتا ہے۔ پھر آگے جانے کے لئے گاڑی تھوڑا پیچھے ہٹتی ہے، پھر کوئی سیٹی، کوئی آواز: ارے ارے، گاڑی چھوٹ گئی، میرا سامان رہ گیا" آخر ... " کوئی کسی کا نہیں، یہ دنیا ..." جب ایک بار تو جی چاہتا ہے آدمی ٹکٹ وکٹ توڑ دے اور گھر جا کر مزے سے بیٹھ جائے، چاہے پھر بیوی سے لڑے ہی۔

زندگی کی فتح مندی یہی ہے کہ اداسی کے سائے میں بھی کہیں خوشی کے جذبے رینگتے رہیں اور گاڑی کے چھوٹتے ہی لپک کر سامنے آجائیں اور ان کی روشنی میں اداسیاں غائب ہو جائیں۔ کبھی جس کے ساتھ پروگرام بنتے تھے، اب اس کے بغیر بننے لگیں۔ موہن نے ایک گہرا سانس لیا: "چلو دو مہینے کے لئے چھٹی۔ کچھ چیزوں کا نہ ہونا ہی ایک طرح کا ہونا ہے۔ سومترا لوٹے گی تو ایک بار اسے بھی پتہ چل چکا ہوگا میرے بغیر زندگی کے کیا معنی ہیں یہ پھر سے غارت کرنے کے لئے اس کی صحت بھی اچھی ہو چکی ہوگی۔ پھر کیسے لپٹے گی یہ الٹا مجھی سے کہے گی ـــــ تو کہاں چلی گئی تھی موہنی"!

موہن وکٹوریہ ٹرمینس کے پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کے لئے مڑا تو الٹی طرف سے کوئی گاڑی پلیٹ فارم پہ آرہی تھی۔ موہن چونک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے سومترا اس گاڑی سے گئی اور اس سے لوٹ آئی ہے۔ جبھی اس نے ایک موٹی عورت کو کمپارٹمنٹ کے دروازے میں پھنسے ہوئے دیکھا، مسکرایا اور چل پڑا۔ اسے ریڈیو کلب جانا تھا۔ تاش کے کچھ مداریوں کے

ساتھ فلاش کھیلنے کے لئے۔ جہاں بیچ بیچ میں کبھی کبھی پان کی بیگم زندہ ہو جایا کرتی تھی اور سمندر سے آنے والے جھکڑ میں اس کی عنابی ساری کا پلو کسی نہ کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا تھا۔ پلو کے ہٹائے جانے تک ساری میں لپٹے ہوئے ایک وجود کے بجائے دو کا احساس ہونے لگتا ......

موہن جا رہا تھا۔ آن جانے میں گھر اور کار کی چابیاں اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی پہ گھوم رہی تھیں۔ دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا جس سے وہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ ٹٹول رہا تھا جبھی اس کی نظر سامنے پڑی۔

"اچی"! وہ رکتے ہوئے بولا۔

موہن اچلا کو جانتا تھا لیکن اتنا بھی نہیں۔ اچلا کے شوہر رام گدکری کو تو وہ شاید زندگی میں ایک آدھ بار ہی ملا ہوگا لیکن اچلا سے اکثر 'مشٹان' میں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ جہاں وہ اپنی ایک اوباش سی سہیلی — دیبی — کے ساتھ ویجی ٹیرین کھانا کھانے آیا کرتی تھی۔ 'نمستے نمستے' کے علاوہ موہن جام اور اچلا گدکری کے بیچ آٹھ دس نہیں تو بارہ پندرہ فقرے ہوئے ہوں گے جن سے پتا چلا تو صرف اتنا کہ وہ بھی کولابا میں رہتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ موہن 'کف پیریڈ' کے ایک اچھے سے فلیٹ میں رہتا تھا اور اچلا کا نوسے برس کی ایک پرانی بلڈنگ میں رہتی تھی۔

شاید موہن اسے 'اچی' کے نام سے نہ پکارتا تھا لیکن دیبی نے موہن کا اس سے تعارف ہی اس نام سے کرایا تھا۔ دیبی کو موہن اچھی طرح سے جانتا تھا۔ دیبی سمجھتی بھی تھی پانی مصری کے لئے کتنا خطرناک ہوتا ہے، اس پر بھی وہ چھوتے ہی کسی بھی پرائے مرد سے گھل مل جاتی تھی۔ اس کی آزاد زندگی کچھ ایسا ہی شربت تھی جو زندگی کی کھلیا میں رات بھر پڑا رہتا ہے، صبح تک

پانی اپنی ہی تیجر سے اڑ جاتا ہے اور پھر سے مصری کی ڈلیاں بھلیا کی تہہ میں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ پہلے سے بھی صاف شفاف، چمکیلی، نوکیلی۔۔۔۔

موہن کے پکارنے پر اچلا نے تھوڑا گھوم کر دیکھا اور صرف اتنا کہا۔

"ہو۔۔۔" اور کچھ دیر بعد بولی۔"۔۔۔ ہن۔"

اور پھر اس نے اپنی ساری کے پلو سے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھ ڈالی۔

اب وہ مسکرا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایکا ایکی کسی نے کوئی سنہرا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ تھوڑا موہن کے قریب آتے ہوئے وہ بولی ۔۔

"آپ ؟ ۔۔ یہاں کیسے ؟"

"بیوی کو چھوڑنے آیا تھا۔" موہن نے جواب دیا۔ "کشمیر جا رہی ہیں بچے کی چھٹیاں ہو گئیں نا۔۔۔۔ آپ ؟"

"میں ؟" اور اچلا ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی اور پھر اسی دم چپ بھی ہو گئی۔ کچھ شرماتے ہوئے بولی: "میں ان کو چھوڑنے آئی تھی۔"

"اوہ" اور موہن بھی ہنس دیا۔ ایک نظر اچلا پہ ڈالنے کے بعد وہ دوسری گاڑی کے انجن کی طرف دیکھنے لگا جس میں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر اچلا کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کہاں گئے گدگری صاحب ؟"

"دلی۔"

"کب آئیں گے ؟"

"یہی کوئی۔۔۔۔ ہفتہ دس دن میں۔" اچلا نے کہا۔ "کوئی کانفرنس ہو رہی ہے"۔

"شاید زیادہ دن بھی لگ جائیں ؟"

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔۔"

اور اچلا اپنے بالوں کو سنوارنے لگی جو پہلے ہی سنورے ہوئے تھے۔

صرف ان میں ایک پن ڈھیلا ہو کر قدرے اوپر اٹھ آیا تھا جسے اچلا نے اپنے مومی ہاتھوں سے دبا دیا۔ جبھی اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ دیر تک اُوپر اُٹھے رہے ہیں۔ موہن کی نظر اس کے پورے بدن کا طواف کرتے ایک پل بہت دیر اس کے بدن کے اس حصہ میں جا رکی تھی جو چولی اور ساری کے درمیان ہوتا ہے۔ ایکا ایکی ہاتھ نیچے کرتے ہوئے اس نے ساری سے اپنے بدن کے ننگے حصوں کو ڈھک لیا۔

موہن نے سوچا۔ بدن کے اس حصے کو انگریزی میں مڈرف کہتے ہیں، اور شہد کی مکھی کی طرح اسٹیشن سے باہر نکلنے تک یہ لفظ اس کے دماغ میں بھنبھناتا رہا: مڈرف . . . مڈرف . . . مڈرف . . . مڈرف . . . .

اور موہن نے اسے دماغ سے نکالنے کی کوشش بھی نہ کی۔ سب بیکار تھا۔ موہن جانتا تھا مکھی کتنی ڈھیٹ ہوتی ہے۔ بار بار اڑ کر پھر آ بیٹھتی ہے جہاں سے اڑائی گئی تھی۔ جھلا کر اسے ہٹانے کی کوشش کریں تو ناک ٹوٹ جاتی ہے، مکھی اڑ جاتی ہے۔

باہر گرمی بہت چپکی چپکی، گیلی گیلی تھی۔ بلاؤز سینوں سے چپک رہے تھے اور اس سونے کی طرح 'خوبصورت' لگ رہے تھے جو کانوں کو پھاڑے ڈالتا ہے۔ پسینے کے قطرے ساریوں اور پتلونوں کے اندر ہی اندر پنڈلیوں پر ٹپکتے اور جونک کی طرح رینگتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اسٹیشن کا چلتا پھرتا پیاؤ پیچھے رہ گیا تھا اور یہ اسی کی وجہ سے تھا جو پیاس اور بھی تیکھی ہو رہی تھی۔ باہر ہال کے ایک کونے میں تھوڑی جگہ ٹھنڈی تھی جہاں اوپر چھت پہ دو پروں والا پنکھا سست سی رفتار سے چل رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک بڈھا منہ کھولے ہوئے سو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی لاش شناخت کے لئے شہر کے

مردہ خانے میں پڑی ہے۔
موہن اور اچلا نے دو چار باتیں کیں اور اس کے بعد ان کی باتیں ختم ہوگئیں۔ دونوں اپنے اپنے ذہن میں کوئی موضوع ڈھونڈ رہے تھے جو زیادہ سوچنے کی وجہ سے ہاتھ میں نہ آرہا تھا۔ اچلا دو قدم آگے جا رہی تھی اور موہن پیچھے۔ جبھی اچلا میں اپنے بدن کے ان خطوں کا شعور عود کر آیا جنہیں عورت بدصورت سمجھتی ہے اور مرد خوبصورت سمجھتے ہیں اور ہر عورت انہیں مفت دکھانا نہیں چاہتی۔ وہ یا پیسے مانگتی ہے اور یا محبت۔۔۔ محبت جو ہمیشہ عریاں ہوتی ہے اور جب کپڑے پہنا دیئے جائیں تو وہ محبت نہیں رہتی اچلا نے اپنے جسم کے پچھلے حصے پہ ساری کھینچ لی۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے نظروں کی برچھیاں پیچھے سے اس کے بدن کے ہر پور پہ لگ رہی ہیں۔
"اچھا، موہن جی" وہ مڑتے ہوئے بولی "میں اب جاؤں گی۔"
"کیسے جائیں گی؟" موہن نے پوچھا۔
"ایسے" اور اچلا نے تھوڑا اچل کے دکھایا اور پھر دونوں کھلکھلا کے ہنس دیئے۔ اتنی سی بات میں دونوں کے بیچ ایک یگانگت پیدا ہوگئی تھی۔ آخر موہن نے کہا "میرا مطلب ہے آپ گاڑی نہیں لائیں؟"
اچی نے سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔"
"میں جو ہوں" موہن نے کہا "آج تھوڑی دیر کے لئے مجھے ہی اپنا ڈرائیور سمجھ لیجئے۔"
"جی" اچلا بولی "نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں بس پہ چلی جاؤں گی ۔۔۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں!"
"آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں" کا جملہ ہی ایسا ہے جس میں کوئی کسی

کو تکلیف دینا چاہتا ہے اور اس سے بچ نکلنے کی گنجائش بھی رکھتا ہے۔ گویا اسے ٹٹولتا ہے: "تم میرے ساتھ کس حد تک بڑھ سکو گے؟" یہ جملہ مرد کہے تو ایک عام سی بات ہوتی ہے، مگر عورت کہے تو ایک خاص بات ہو جاتی ہے۔ یہ عورتوں کے فقرے، جیسے "جھوٹے کہیں کے!" "میں مر گئی" وغیرہ۔

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟" موہن بولا: "میں گھر ہی تو جا رہا ہوں راستے میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔"

گویا ریڈیو کلب موہن کے دماغ سے اپنے آپ براڈ کاسٹ ہو گئی تھی۔

تھوڑی حیص بیص کے بعد اچلا گدکری موہن جام کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی فریئر روڈ کی طرف سے نکلی۔ کراسنگ پہ پولیس مین نے الٹا ہاتھ دیا ہوا تھا جس کی وجہ سے موہن کو گاڑی روکنی پڑی۔ موہن پولس مین کے الٹے ہاتھ پہ ہمیشہ جھلایا اور منہ میں گالیاں منمنایا کرتا تھا۔ لیکن اب کے وہی ہاتھ اسے مسیح کا ہاتھ معلوم ہو رہا تھا۔

"ڈیبی کیسی ہے؟" موہن نے آخر گفتگو کا موضوع ڈھونڈھ ہی لیا۔

اچلا نے جواب دیا۔ "ویسی ہی۔"

"کیا مطلب؟" موہن نے چونکتے ہوئے کہا: "میں تو سمجھتا ہوں وہ ایک بہت ہی نیک لڑکی ہے۔"

"میں نے کب کہا بری ہے؟" اچلا بولی اور ہنسنے لگی۔

موہن اچلا کے جال میں آ گیا تھا اور اب یوں ہی بچ نکلنے کے لئے ادھر ادھر اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ پسینے کے قطرے اس کے ہاتھ پہ چلے آئے۔ اچلا اس سے دور ہٹ کر دروازے سے لگی بیٹھی تھی جیسے کپڑا بھی چھو گیا تو کوئی رشتہ پیدا ہو جائے گا۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لئے موہن بولا: "آپ مجھ سے

اتنی دور کیوں بیٹھی ہیں"؟

"یونہی" اچلا نے کہا اور مشکل سے ایک انچ پھر موہن کی طرف سرک آئی "میں نے سوچا آپ کو گیئر بدلنے میں تکلیف نہ ہو"

"پھر وہی ـــ تکلیف"!

جب تک پولیس مین نے ہاتھ دیدیا تھا لیکن موہن کی کار بدستور کھڑی تھی۔ پولیس مین کی سیٹیاں اور پچھلی کاروں کے ہارن ایک ساتھ سنائی دینے لگے۔ موہن نے جلدی سے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور گھبراہٹ میں فوراً پیر کلچ پر سے ہٹا لیا۔ گاڑی جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی، بند ہوتے ہوتے رکی، پولیس مین سے کچھ آگے نکلی تو اچلا بولی "کیا آپ گاڑی ایسے ہی چلاتے ہیں"؟

"نہیں" موہن نے کہا "میں تو اتنے پیار سے چلاتا ہوں کہ پتہ بھی نہیں چلتا ـــ مگر آج ۔۔۔"

"آج کیا ہوا"؟

"آپ ہوئی ہیں ـــ اور کیا ہوگا"؟

موہن اور اچلا ٹاؤن ہال کے سامنے سے جا رہے تھے۔ نہ معلوم کیوں موہن کا جی چاہ رہا تھا، آج کوئی ایکسی ڈنٹ ہو جائے۔ ایک بس تیزی سے گذری اور موہن کو اپنے اندر اس عجیب سی خواہش کو دبانا پڑا۔ سامنے ہال کی طرف جاتی ہوئی سیڑھیوں پر سے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے موہن نے کہا۔

"کتنا اچھا ہے"؟

"بہت اچھا ہے"!

الفنسٹن سرکل کی طرف سے جوانی کے عالم میں بپھری ہوئی ایک بے حد خوبصورت لڑکی ایک لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے رجسٹرار کے دفتر کی طرف

جا رہی تھی۔ شاید اس کی شادی ہونے والی تھی اس لئے اس کا چہرہ کسی اندرونی تمازت سے تمتمایا ہوا تھا۔ اچلا نے موہن سے پوچھا: "آپ کو کیسی معلوم ہوتی ہے"؟

"اچھی"۔

اور موہن نے 'اچھی' کچھ اس انداز سے کہا کہ اچھی اور اچی میں کوئی فرق نہ رہا۔ اچی خوش ہو گئی۔ کوئی کیا کر سکتا تھا؟ وہ خوش ہو گئی۔ یونہی دکھاوے کے لئے بولی: "میں اتنی خوبصورت کہاں ہوں"؟

موہن نے ایک نظر اچلا کی طرف دیکھا اور سب وہ کہہ دیا جو وہ یوں نہ کہہ سکتا تھا۔

کاما ہال، لوائین گیٹ گذر گئے اور موہن کی گاڑی ریگل سینما کے پاس سے نکل رہی تھی۔ سامنے کا بٹ من موہنا تھا۔ ریگل میں تصویر اچھی تھی پھر گرینڈ بازار من موہنا تھا، بھلیرے کی دکان اچھی تھی۔ گاڑی کا زوے پر سہیتہ سدن کے سامنے رک گئی جہاں اچی رہتی تھی۔

اچی نے چھچھلتی ہوئی نظر سے ادھر ادھر دیکھا سوائے سامنے کے ٹیلر ماسٹر کے، جو اچی کا ماپ جانتا تھا، کسی دوسرے نے اچلا کو موہن کی کار سے اترتے نہ دیکھا تھا۔ دیکھتا بھی تو اسے کیا پروا تھی؟ موہن کو کیا حیا تھی۔ اس پہ بھی ایک دم دروازہ کھول کر اچلا گاڑی سے اتر گئی۔ تھوڑا ٹھٹک کر کہا: "اچھا موہن جی، بہت بہت شکریہ"۔ اور چل دی۔

موہن بدستور ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ایک ٹانگ اندر تھی اور دوسری کھلے ہوئے دروازے سے باہر۔ وہ اتر کر اچلا کے لئے دروازہ کھولنا چاہتا تھا لیکن اس نے موقع ہی نہ دیا۔ کچھ دور جا کر اچلا کو جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ تھوڑا رکی اور جو کہا بھی تو صرف اس لئے کہ وہ اسے نہ کہنا چاہتی تھی اور اپنے اندر کسی

فقرے کورو کے ہوئے تھی، لیکن بعض اوقات جسم روح سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔
"کبھی آیئے گا، موہن جی"
اور موہن کے جواب کا انتظار کئے بغیر اچلا گھر کی طرف لپک گئی۔ پیچھے جیسے موہن ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ "آؤں گا، آؤں گا، کیوں نہیں"۔
اچلا کا خیال تھا۔ "موہن اتنا تو سمجھ دار ہوگا ہی۔ ان کے گھر پہ نہ ہونے پر۔۔۔ کتنا برا معلوم ہوتا ہے، یہ دعوت تو صرف تکلف کی بات ہے!"
موہن واقعی سمجھدار تھا، ورنہ وہ دوسرے ہی دن اچلا کے ہاں پہنچ جاتا جب کہ اپنے پتی رام گد گری کا اچلا کے دماغ میں تصور بھی موجود نہ تھا۔
موہن جام نے گھنٹی کچھ اس زور سے بجائی کہ اچلا گھبرا کر بھاگی چلی آئی۔ جیسے رام اگلے روز ہی کسی پشپ بوان پر بیٹھ کر آگئے۔ ابھی تو اسے کپڑے بھی ٹھیک کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منہ باہر نکالا اور پھر ایکا ایکی پیچھے ہٹ گئی، اپنے آپ میں سمٹ گئی اور بولی۔ "ذرا رک جایئے۔۔۔۔"
اور وہ اندر بھاگ گئی۔
موہن میں اتنی تاب ہی کہاں تھی، وہ تو نیچے ہی سے یوں آیا تھا جیسے فسٹ گیئر میں لگا ہو۔ اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور وہ کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ڈرائنگ روم میں تھا۔ اس کے تو سر پہ بھی جیسے کوئی آنکھ تھی جس سے چھت تک دکھائی دے رہی تھی۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں سے اچلا کا بیڈ روم صاف دکھائی دیتا تھا۔
عورت اور گھر میں فرق ہی کیا ہے؟ کم سے کم پوچھ تو لینا چاہئے، آخر اتنا بھی کیا؟ لیکن موہن پیر سے سر تک اڈا ہوا تھا جیسے اچلا بیڈروم کے کھلے دروازے

میں سے سہمی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں بالکل ایسے تھے جیسے جذبات اور خیالات، آنکھوں اور جسم کے اعتبار سے بھگوان نے انہیں بنایا تھا۔ اچلا پلنگ کی پائنتی پر سے ساری اٹھا کر جلدی جلدی میں اسے نیچے کے کپڑوں میں لپیٹ رہی تھی۔

"معاف کیجئے ......" موہن جام نے وہیں سے کہا۔

اور وہیں سے، ویسا ہی، اچلا نے جواب دیا: "کوئی بات نہیں۔"

ڈرائنگ اور بیڈروم کے بیچ ایک چھوٹی سی جگہ تھی جہاں شیشے کی ایک کیبنٹ کے اندر شیوجی بھولے ناتھ کی تصویر ٹنگی تھی اور اس پہ ایک باسی سا ہار لٹک رہا تھا۔ یہی نہیں، ساتھ کنواری مریم کی شبیہہ بھی تھی اور گورو نانک کی بھی، اور اس کے ساتھ ہی باہر ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا جس پہ لیڈا ننگی کھڑی تھی اور راج ہنس اسے اپنے پروں میں دبائے، چونچ اٹھائے خوشہ چینی کی کوشش کر رہا تھا۔

اس ایک لمحہ میں موہن جام نے دنیا بھر کی عورتیں دیکھ لی تھیں: سومترا دیکھ لی تھی اور دیبی دیکھ لی تھی، زازا گیبور دیکھ لی تھی، کوئی اور بھی دیکھ لی تھی اور رادھا دیکھ لی تھی جو موہن کی سگی بہن تھی اور بریلی میں اپنے ویونگ ماسٹر میاں کے ساتھ رہتی تھی۔

موہن نے عورت کو ہمیشہ مایا کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور معلوم ہوتی تھی۔ اچھا اور برا، گناہ اور ثواب، کبھی خوبصورت کبھی بدصورت طریقے سے آپس میں گھلے ملے ہوئے تھے۔ پھر جو عورت کپڑوں میں بھری ہوئی دکھائی دیتی وہ دبلی نکلتی اور دبلی دکھائی دینے والی بھری ہوئی۔ اسے ہی تو مایا کہتے ہیں یا لیلا۔ مثلاً: ایسی تندرست عورت جیسے

دیکھتے ہی گہرے میں درد ہونے لگے، اس سے ڈرنا بیکار کی بات ہے، اور ہڈیوں کے ڈھانچے سے الجھنے میں اتنا بھی نفع نہیں ہوتا جتنا کسی مزدور کو بیس سیر لکڑیاں کاٹنے سے ہوتا ہے ... "

مایا، جس کے بارے میں سوچیں کہ یہ رام ہوئی، وہیں اپنی حکمت ناکام ہوئی اور جس کے بارے میں کہیں یہ ہاتھ نہ آئے گی، آخر وہی گردن دبائے گی۔ اور مایا کیا ہوتی ہے؟ البتہ ایک اور مایا ہوتی ہے جو پا لینے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس دنیا سے جاتے سمے یوں معلوم ہوتا ہے آپ نے کسی کو نہ پایا، آپ کو سب نے پالیا۔

جبھی ساری اور بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے اچی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ وہ کتنی حسین لگ رہی تھی یا کیا صرف اس لئے کہ وہ دوسری عورت تھی؟ نہیں نہیں، وہ پہلی ہوتی تو بھی اتنی ہی خوب صورت معلوم ہوتی۔ اس میں کوئی بات تھی جو کسی دوسری میں نہ تھی۔ لیکن ... ایسا تو پھر ہر ایک کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، مگر اس کی بھوؤں پہ بچپن کی چوٹ کی وجہ سے ہلکی سی خراش تھی جس نے بالوں کی تحریر کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اور وہ خراش ہی تھی جنہیں چوم چوم لینے کو جی چاہتا تھا۔

موہن کے قریب آتے ہوئے پھر سے ہاتھ اوپر اٹھا کر اچی نے سامنے سے اپنے بال قدرے اوپر اٹھا دیئے۔ وہ بالوں کا ایک Tiara سا بن گیا تھا۔ سونے اور ہیرے کے تاج جس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی ہی ساری کے پلّو سے اپنے آپ کو ہوا دیتے ہوئے بولی "اُف! آج کتنی گرمی ہے!"

اور پھر ہاتھ دائیں طرف بڑھاتے ہوئے دیوار پر پنکھے کے سوئچ کو دبا دیا۔ جبھی موہن بولا "میں سوچ رہا تھا ... "

"کیا سوچ رہے تھے آپ؟" اچلا نے ایک منتظر نگاہ سے موہن کی طرف دیکھا۔
"یہی،" موہن نے کہا، "کہ آج گرمی کتنی ہے۔۔۔ اُف!"

اور جب پنکھے سے ہوا کا پہلا جھونکا آیا تو موہن اور اچلا تسکین کا سانس لیتے ہوئے آمنے سامنے صوفے پہ بیٹھ گئے۔ کتنا ظلم تھا! وہ ایک دوسرے کے پاس بھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ سب کچھ کتنا غیر فطری معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ٹھیک بھی تھا۔ اگر دنیا بھر کے مرد عورت فطری زندگی گذارنے لگیں تو کیا ہو؟ لیکن ۔۔۔ مرد اور عورت دونوں نامکمل ہیں۔ ان کی تکمیل ۔۔۔ جسموں کو مارئیے گولی، روحوں کو پا لینے کے لئے بھی کیا ایلا سکا سے ہو کر آنا پڑے گا؟

ایسے ہی تکلف میں لوگ ایک دوسرے سے میلوں دور چلے جاتے ہیں، پھر عجیب طرح کی کشاکش شروع ہوتی ہے، جان نہ پہچان اور آتے ہی ہاتھ پکڑ لیا! اور یہ بھی، پہلے کیوں نہ بلایا؟ کیا سمجھتے ہو؟ محبت کے کھیل میں تو پہلی نظر، پہلا جملہ اور پہلی ہی حرکت ابد پہ چھا جاتے ہیں! ایک دن وہی ایک پینٹر کے بارے میں، جس سے وہ محبت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہے، کہہ رہی تھی: "میں تو اپنا سب کچھ اس پہ لٹا دیتی، لیکن چھوٹتے ہی کیسے بھونڈے طریقے سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے سب چھوٹے بڑے راز جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسے تھوڑی ہوتا ہے۔ میں نے اسی بھونڈے طریقے سے اسے روک دیا۔ اب میں اس کے پیچھے بھاگ رہی ہوں اور وہ کسی ضد میں پڑ گیا ہے۔ جانے سمے کا وہ کون سا انش تھا جس میں ۔۔ ۔۔ ۔۔ سنا ہے وہ اگری پاڑے میں کسی رنڈی کے پاس جاتا ہے۔"

اچلا کے کوئی بچہ نہ تھا۔ پانچ چھ سال کی شادی کے باوجود اس کی ممتا ویسے ہی دبی پڑی تھی۔ البتہ پندرہ سولہ برس کی ایک نوکرانی تھی جو

اچی کے اشارے پر چائے بنا کر لے آئی۔ پھر ایک پلیٹ میں ختائیاں بھی لائی جو اچلا نے گھر میں بنائی تھیں اور جن پہ پستہ فراوانی سے بکھرا ہوا تھا۔ نوکرانی نے موہن کو کبھی دیکھا تو نہیں، کے انداز میں دیکھا اور پھر رسوئی میں کام کرنے کے لئے چلی گئی۔

"لڑکی اچھی معلوم ہوتی ہے" موہن نے ختائی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اورا چلا نے اندر کی طرف دیکھا "پر جوان لڑکیوں کو گھر میں رکھنا نہیں چاہئے"

"کیوں؟ رکھنا کیوں نہیں چاہئے؟"

"کیا بتاؤں" اورا چلا ہنس دی "روز کوئی نیا البیلا دروازے پر موجود ہوتا ہے"

اور پھر دونوں مل کر ہنسے۔ موہن نے بات شروع کی "میں بھی تو ہوں"

اچی کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ نگاہیں چراتے، چائے میں چمچ ہلاتے ہوئے وہ بولی "آپ کی بات دوسری ہے" اور پھر ایکا ایکی "اب کے رام آئیں گے تو میں انہیں آپ سے ملواؤں گی، بڑے مزے کے آدمی ہیں"

موہن نے چھیڑا "اس کا مطلب ہے اس سے پہلے نہ آؤں؟"

"نہیں نہیں" اچلا نے گھبراتے ہوئے کہا "آپ جب جی چاہے آئیے، آپ کا اپنا گھر ہے"

پھر اچلا نے سوچا۔ وہ کیا کہہ گئی؟ عورت ہونا بھی ایک ہی مصیبت ہے کیوں وہ ہر وقت ڈری رہتی ہے؟ کیوں کہتی کچھ ہے، مطلب کچھ اور ہوتا ہے؟

اور اچلا نے رام گدکری کی باتیں شروع کر دیں، جیسے ان سے اچھا مرد کوئی اس دنیا میں نہیں۔ ایک رام ایودھیا میں پیدا ہوئے اور ایک اب

بیسویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں اور کولابا میں رہتے ہیں۔

موہن جام کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سومترا کی باتیں کہے، دونوں میں فاصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا اور برابر بڑھتا جا رہا تھا — ان کے جانے بوجھے بغیر، وہ ایک دوسرے سے دور ہو کر قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ موہن نے بتایا: "سومترا بڑی گریٹ عورت ہے لیکن اس کی صحت کی خرابی نے پوری زندگی پر غم کی ایک چھاپ لگا دی ہے"

جبھی نوکرانی ہاتھ پونچھتی ہوئی آئی: "بائی میں جاؤں؟"

"نہیں نہیں"۔ اچلا نے موہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "کپڑے دھو جا کر، دیکھتی نہیں غسل خانے کے پاس کتنا ڈھیر لگا ہے؟ چلو، چلو۔۔۔"

اور نوکرانی منہ پھلائے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔

موہن بدستور سومترا کے بارے میں کہہ رہا تھا: "دس سال سے جس عورت نے تمہارا ساتھ دیا ہو اسے تم صرف اس لئے چھوڑ دو کہ وہ بیمار ہے! جس نے اپنی جوانی کے بہترین سال تمہاری خدمت میں لگا دیئے اور جس کی صحت کی خرابی کے تم ذمہ دار ہو۔۔۔۔۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔"

اور موہن کی آنکھوں میں آنسو چلے آئے۔

اچلا کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس میں برسوں کی دبی ہوئی کوئی چیز ابل پڑی "نہیں نہیں، موہن جی"۔ وہ بولی: "ٹھیک ہو جائیں گی"۔ اور پھر موہن کے ایک دم پاس پہنچتے ہوئے اس نے اپنی ساری کے پلو سے موہن کی آنکھیں پونچھ دیں۔

موہن ایک قطعیت کے ساتھ اٹھا اور پھر بولا: "اچھا اچلا — میں چلوں گا"۔

"بیٹھئے تو —— کچھ دیر"۔ اچلا نے پھر ویسا ہی جملہ کہا۔

لیکن موہن نے انکار کر دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا

اور بولا " مجھے ساڑھے گیارہ بجے اجوانی ہیڈ کوارٹرز میں جانا ہے "

اور موہن فریادی نظروں سے اچلا کی طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

اچلا اٹھی، وہ مسکرا رہی تھی۔ بیڈ روم میں جا کر اس نے اپنے سراپا کی طرف

دیکھا۔ وہ کیسی لگ رہی تھی؟ اسے اپنا آپا اچھا لگا۔ پھر وہ نوکرانی کے پاس پہنچی

" تمہارا وہ جوہنی نہیں آیا؟" اچلا نے کہا۔

اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے روزی بولی " وہ صاحب جو آئے

تھے ... چلے گئے؟"

"ہاں" اچلا کو کتنی تسلی تھی۔

" تم جاہنی کے ساتھ پکچر چلی جانا" اچی نے کہا " تمہارے سب لڑکوں میں

ایک وہی مجھے ٹھیک معلوم ہوتا ہے "

اور روزی ایکا ایکی خوش ہوا ٹھی۔

اچی سے موہن کی غالباً یہ پانچویں یا چھٹی ملاقات تھی۔ اب وہ ٹیلر یا سد

اور دوسرے لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی موہن کی کار میں آبیٹھتی تھی اور

دونوں شام کو ہوا خوری کے لئے نکل جاتے تھے۔

اس اثنا میں موہن نے سومترا کو ہفتے میں ایک چٹھی لکھنے کی بجائے

تین تین لکھنا شروع کر دیں۔ ایک چٹھی میں تو مذاق بھی کیا " اگر تم نہ آوگی تو

میں کسی دوسری سے لو لگا لوں گا " اور یوں اس نے سومترا کو بے فکر کر دیا۔

ایک شام برنیچ کے پاس سے ہوتی ہوئی گاڑی بیگ بے کے پاس

اندھیرے میں کھڑی ہو گئی۔ اچلا نے بھی اعتراض نہ کیا۔ آج وہ یا نہیں دروازے

کے ساتھ لگ کر بیٹھنے کی بجائے سیٹ کے بیچ بیٹھی تھی۔ موہن جام کے ہاتھ سیٹ

یہ اچی کے گرد تھے اور اچی ایک ہاتھ سے نیوٹرل میں پڑے ہوئے گیئر کو فسٹ اور سیکنڈ میں لگا رہی تھی، جیسے وہ گاڑی چلانے کی مشق کر رہی ہو۔

موہن نے اچلا کا ہاتھ تھام لیا، مزاحمت تو ایک طرف، اس نے موہن کا ہاتھ دبا دیا، اور وہ دونوں کچھ لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے، حتیٰ کہ موہن کو کہنا پڑا۔ "گدکری کب آنے والے ہیں؟"

"یہی کوئی دو ایک دن میں۔"

"کانفرنس لمبی ہو گئی؟"

"بھگوان جانے ــــ ان مردوں کا کیا پتا، کسی سوتن کے سنگ راس رچا رہے ہوں۔"

"کیا بات کرتی ہو"، موہن نے اچی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "وہ تو بھگوان رام ہیں تمہارے لئے۔"

"بھگوان رام ہوتے تو سیتا کو ساتھ نہ لے جاتے؟"

موہن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب سیتا کانفرنس میں تھوڑے جا سکتی ہے۔"

اور موہن نے اچی کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے کچھ اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ اچی نے تھوڑی سی مزاحمت کی لیکن پھر جیسے اپنے آپ خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یوں بھی کسی آسائش کی ضرورت تھی، کیونکہ جب سے گاڑی بیک ہے میں آکر اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اندر ہی اندر کانپنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی نسوں کو کسی آرام کی ضرورت تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا سر موہن کی چھاتی پہ رکھ دیا۔

موہن اچلا سے پیار کرنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی گاڑی کے پاس چلا آیا اور بولا۔ "ناریل پانی۔"

"نہیں چاہئے۔" موہن نے اچلا سے تھوڑا الگ ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن ناریل والے کو بدستور وہیں کھڑا پا کر وہ ایک دم جھلا اٹھا۔ "ابے کہا نا۔۔۔ نہیں نہیں چاہئے۔۔۔۔ اور پھر "جاتا ہے یا۔۔۔۔" اور موہن جیسے اسے مارنے کے لئے لپکا۔

اچلا نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ "کیا کر رہے ہو۔" کچھ گھبراتے اور اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے بولی۔ "دیکھتے نہیں ہاتھ میں چھری ہے۔"

"ہو گی۔" موہن نے بے پروائی کے انداز میں کہا۔

ناریل والے نے اپنی مالاباری زبان میں کچھ کہا اور چلا گیا۔ کچھ دور پتھر کی دیوار پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے آواز دی "مجا کرا بابو۔۔۔۔ مجا کرا۔۔۔۔"

موہن تھوڑا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اچلا سے کہنے لگا۔ "گھر چلتے ہیں۔"

"کس کے گھر؟"

"میرے۔۔۔۔ تمہارے، روزی کیا وہیں ہو گی؟"

"نہیں ۔۔ وہ پکچر دیکھنے گئی ہے، اپنے جو ہنی کے ساتھ۔"

"تو پھر ۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔"

"نہیں نہیں۔" وہ بولی۔ "گھر پہ ہمیں کیا کرنا ہے؟"

دراصل اچلا کو گھر میں شیشے کا کیبنٹ اور اس میں لگی ہوئی تصویریں یاد آ گئی تھیں۔ وہ تو اپنے شوہر سے بھی پیار کرنے سے پہلے بیچ کا دروازہ بند کر لیا کرتی تھی۔ اس کے بعد پتھر پہ بیٹھے ہوتے بے فکرے کی موجودگی کے احساس سے بے خبر ہو کر جب موہن نے اچلا کا منہ چوما تو اس میں پہلی سی خود سپردگی نہ رہی تھی۔ "نہیں نہیں۔" اس نے خفیف سا کہا جو احتجاج

تھا اور نہیں بھی۔ البتہ جب موہن نے ہاتھ بڑھا کر اچی کے چھوٹے بڑے راز معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ بدک کر الگ ہو گئی۔ موہن کو برا سا لگا۔ اس نے کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد پھر ایک بھرپور حملہ سا کیا لیکن اچلا کسی نہایت ہی مضبوط قلعے میں محبوس ہو بیٹھی تھی۔ وہ شکایت کے لہجے میں بولی: "نہیں نہیں، اتنا ہی بہت ہے۔"

"بے وقوف نہ بنو، اچی۔" موہن نے برافروختہ ہو کر کہا "نہیں تم بھی دیبی کی طرح پچھتاؤ گی۔"

"نہیں موہن۔" اچلا نے بڑے پیار سے روٹھتے ہوئے کہا: "پیار کا یہی مطلب تھوڑے ہوتا ہے۔"

"جو ہوتا ہے وہ سمجھا دو۔"

"کیوں، بہن بھائی کا پیار نہیں ہوتا؟"

"ہوتا کیوں نہیں۔" موہن نے اپنی مردانہ خفت کو چھپاتے ہوئے کہا اور اسے اپنی بہن رادھا یاد آ گئی جو پاریل میں رہتی تھی۔

"یہ رشتہ تو ہم ہمیشہ نہیں رکھ سکتے۔" اچی بولی: "ایک دو دن میں وہ آجائیں گے، مہینے ڈیڑھ مہینے میں سومترا بہن بھی لوٹ آئیں گی۔"

"ہوں۔"

"بہن بھائی کا پیار ہے جس میں کوئی ڈر نہیں، کوئی کھٹکا نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" موہن نے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "آج سے میں نے تمہیں بہن کہا۔" اور موہن نے زناٹے سے گاڑی چلا دی۔

اچی بہت ڈر گئی تھی، اس نے دونوں ہاتھوں سے موہن کا بایاں بازو پکڑ لیا اور شانے پہ اپنے بالوں کا خوبصورت تاج رکھتے ہوئے بولی: "تم

تو روٹھ گئے۔"

"روٹھوں گا کیوں" ہ موہن نے کہا "بھلا بھائی بہن سے روٹھ سکتا ہے"۔

اچلا نے جھٹکے سے اپنا سر موہن کے کاندھے سے ہٹا لیا۔

کچھ دیر کے بعد گاڑی سینہہ سدن کے سامنے کھڑی تھی۔ آج دروازہ کھولنے کے لئے موہن نے ذرا بھی جہد نہ کی۔ اچلا بے دلی سے اتری۔ سامنے کا ٹیلر ماسٹر غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور آس پاس کے کچھ لوگ بھی۔ لیکن اچلا کو جیسے کوئی ڈر نہ لگ رہا تھا۔ اس نے آج موہن کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ وہ بے حد متفکر تھی۔ ایسے وسوسے اور ڈر اس کے دل میں پیدا ہو گئے تھے جنہیں وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ اسے ایک ڈر تھوڑے تھا، ہزاروں تھے جن میں سے ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا اور پہچاننا ممکن نہ تھا۔

"اب آؤ گے" ہ اس نے پوچھا۔

"آؤں گا، آؤں گا کیوں نہیں"۔ موہن نے کہا اور پھر ایک دم کھلکھلا کر ہنس دیا، جیسے کوئی بچے کو ڈرا تو سکتا ہے مگر ایک حد تک۔

اس کے بعد موہن "ٹاٹا" کہہ کر چلا گیا۔ اچلا جب گھر لوٹی تو کئی قسم کا بوجھ اس کے سر سے اتر چکا تھا۔

اگلے ہی روز گدگری چلے آئے۔

اچی انہیں اسٹیشن پہ لینے گئی تو دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کے شوہر نے مونچھیں رکھ لی ہیں۔

"یہ کیا" ہ اچلا نے پوچھا۔

"ایسے ہی" ہ اس کے پتی نے ہنستے اور ایک نہایت ہی عاشقانہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "من کی موج"!

اور پھر قلی کے سر پہ سوٹ کیس رکھواتے، اچی کے پاس آتے ہوئے بولا" بری لگتی ہیں"؟

" نہیں، بری تو نہیں لگتیں مگر ـــــ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کسی اور ہی مرد کے ساتھ جا رہی ہوں۔" اچلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رام گدگری نے چھیڑا" اچھا ہے نا، ایک ہی زندگی میں دو مرد دیکھ لئے۔"

اس نے سوچا، اچی ہنسے گی اور اس لطیفے سے پورا لطف اٹھائے گی یا دھپ سے پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہے گی" شرم نہیں آتی"۔ لیکن اچلا نے کچھ بھی نہ کہا۔ الٹا جیسے کسی فکر کی پرچھائیاں اس کے چہرے پر سے گذر گئیں۔ ایک متجسس نگاہ سے اس نے رام کے چہرے پر دیکھا جو مونچھوں کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ بیوقوف نظر آ رہا تھا۔ اچلا کو یقین آ گیا کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ اب وہ پیار کی باتیں کر رہی تھی مگر رام گدگری کانفرنس کا قضیہ لے بیٹھے تھے۔

گھر پہنچکر اچی نے اپنے پتی کو سامان بھی ٹھیک سے نہ رکھنے دیا۔ وہ ایک بچی کی طرح مچل گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر بیڈ روم میں لے گئی اور اس کے گلے لگ کر زار زار رونے لگی۔ رام گدگری حیران ہی تو رہ گیا۔" ارے گیارہ ہی دن تو لگے ہیں۔"

لیکن اچی رو رہی تھی اور مچل رہی تھی۔ اسے لپٹاتے، دلاسا دیتے ہوئے آخر میں رام نے کہا۔" مجھے کیا معلوم تھا تم اتنا ہی ڈر جاؤ گی۔"

" میں یہ سب ڈر کے مارے کر رہی ہوں"؟ اچلا نے ایک دم پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

" نہیں، پیار کے مارے"! اور رام گدگری ہنس دیا۔ آگے بڑھ کر پھر سے اچی کو کلاوے میں لیتے ہوئے بولا" میں جانتا ہوں اچے، میں بھی تم سے اتنا

پیار کرتا ہوں۔"

"بس؟"

"اس سے بھی زیادہ۔"

"جھوٹے کہیں کے، مجھ سے پیار کرتے تو یہ ــــ مونچھیں رکھتے؟"

اچلا کا خیال تھا رام نے مونچھیں کسی لڑکی کی انگیجمنٹ پہ رکھی ہیں۔ رام سمجھ گیا۔ اسے اچلا کے جذبات سے زیادہ اپنے سمجھ جانے پہ خوشی تھی۔ پیار میں اس نے منہ آگے بڑھایا تو اچلا نے اپنا منہ پیچھے کی طرف موڑ لیا جس پہ رام نے وعدہ کیا کہ اگلے ہی روز وہ مونچھیں ووچھیں سب منڈوا ڈالے گا۔ اپنی ہی نہیں، بھی دکھائی دے گا اس کی بھی۔

دو ایک روز کے بعد وعدے کے مطابق، موہن جام چلا آیا۔ پہلے تو اچلا چونکی، پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ اپنے پتی رام گدگری کی طرف بڑھا اور بولی "جی، میں نے آپ کو بنایا ہی نہیں، میں نے اپنا ایک بھائی بنایا ہے۔"

"بھائی، بنایا ہے؟"

"ہاں۔" اچلا کہنے لگی "کیا بھائی نہیں بنائے؟"

اور اس طرح رام گدگری کو پکڑ کر اچلا موہن جام سے ملوانے کے لئے اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ دونوں مرد ایک دوسرے سے اس طرح ملے جیسے نا سمجھی کے عالم میں ملتے ہیں۔ یہ نہیں کہ رام گدگری نے موہن جام کو ٹھیک طریقے سے اٹھایا بٹھایا نہیں یا اس کی مناسب خاطر مدارات نہیں کی۔ اس نے سب کچھ کیا لیکن وہ ایسے ہی تھا جیسے آدمی کچھ نہیں سمجھتا مگر کئے چلا جاتا ہے مسکراہٹیں بنا دی تھیں، ہنسی بنا دی۔ ہی ہی ہی ... ...

اور اچلا تھی کہ لٹی جا رہی تھی، ایک بار بھائی کہہ دینے کے بعد جیسے

چھٹی ہو گئی تھی۔

اس نے نہ صرف چائے ختائی وغیرہ سامنے رکھیں بلکہ روزی کو بھی بازار بھیجا کچھ نمکین چیزیں لانے کے لئے۔ رام گدگری یہ سب برداشت کر رہا تھا لیکن ایک چیز جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، وہ یہ تھی کہ موہن جام کے آنے پر اچلا اسے کیوں بھول چکی تھی جو اس کا پتی تھا، اس کے بھائی کا جیجا! اور رام گدگری دیکھ رہا تھا کہ ایسا کرنے میں اچلا کتنی بے بس ہے۔

جب کوئی چیز لینے کے لئے اچلا اندر جاتی تو یہ دو لوگ ایک دوسرے سے سرسری طور پر تکلف محض تکلف میں ایک آدھ جملہ کہتے۔ رام گدگری کچھ کانفرنس کا رعب ڈالنے کی فکر میں تھے اور موہن جام اس مال کی شپمنٹ کا ذکر کر رہے تھے جو انہوں نے ابھی ابھی جاپان سے منگوایا تھا۔ دونوں فقرے بیچ میں ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔

اچی اندر سے آئی تو اس نے ساری بھی بدلی ہوئی تھی اور سامنے کے بالوں کا پھر سے کراؤن بنا لیا تھا اور خوشی تو اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی تھی۔

"بھابی نہیں آئیں بھائی صاحب؟" اچلا نے پوچھا اور پھر رام گدگری کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی: "وہ کشمیر گئی ہیں۔ میں تو ملی نہیں۔ سنا ہے بڑی اچھی عورت ہے۔"

"ضرور اچھی ہوگی۔" رام نے اتفاق کیا۔

اور رام پھر ایک متعجب سی نگاہ سے موہن جام کی طرف دیکھنے لگا۔

سب کچھ کھا چکنے اور مصافحے کے بعد موہن جام اٹھ کر چل دیا۔ "میں ابھی آتی ہوں" کہہ کر اچلا دروازے تک اسے چھوڑنے گئی۔ اور پھر کسی خیال کے آنے سے وہ دروازے سے نکل کر لینڈنگ تک، اور پھر لینڈنگ سے بھی

نیچے چلی گئی، حالانکہ اس کا شوہر مہمان کو رخصت کرنے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے محض تکلفاً اٹھا تھا۔ یوں بھی سالے بہنوئی میں سالے کا رشتہ چھوٹا ہوتا ہے۔

نیچے، بازار میں آنے سے پہلے موہن جام کا جی چاہا کہ وہ اچی سے پیار کرے۔ اچی کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی! وہ صرف اس کا ہاتھ پکڑ سکا جسے اس نے کچھ پیار سے دبایا اور بولا "اچی! کبھی تم میرے ہاں آؤ نا۔"

"آؤں گی" اچی نے کہا، "ان کو بھی لاؤں گی۔"

اس کے بعد اچلا گاڑی تک چلی آئی۔ موہن جام رخصت ہوئے تو — اچلا اور موہن — دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اچلا اتنی ہی تیزی سے اوپر آ گئی۔

رام گدکری کو اچلا نے سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ بولتی چلی گئی: "دیکھئے میرے بھائی صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں، لاکھوں میں ایک ... ..."

رام سر ہلاتا گیا حالانکہ اس کے ماتھے پہ تیوریاں تھیں۔ یہ بیچ میں خواہ مخواہ کا بھائی آ ٹپکا، اس کی ضرورت کیا تھی۔ کچھ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ جبھی تو اس نے کہا: "اگر سچ مچ تمہارا بھائی کا رشتہ ہے تو بھائی صاحب کیوں کہتی ہو، بھیّا جی کیوں نہیں کہتیں؟"

"لو، یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟"

اور اچلا بدستور موہن کے گن گاتی گئی: کیسے وہ دیبی کے ساتھ سیر کر رہی تھی تو کچھ موالی پیچھے لگ گئے۔ اگر موہن جام وہاں نہ ہوتا تو جانے کیا ہوتا، اور اچلا کو اس رشتے کی صحت اور صفائی جتانے کے لئے اور بھی بہت سے جھوٹ بولنے پڑے جن کی ضرورت نہ تھی — کیوں کہ یہ

رشتہ بھگوان نے نہیں انسان نے بنایا تھا۔

اس کے بعد ایک دو بار موہن جام آیا اور اچلا اسی طرح سے بے اختیار اور بے خود ہلکی جھپکی۔ موہن جام کے چلے جانے کے بعد رام گدگری دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ اپنی خاموشی انہیں خود ہی ناگوار سی محسوس ہونے لگی۔ سامنے طاق پر ٹرانسسٹر پڑا ہوا تھا جس کی سوئی گھماتے ہوئے رام نے اچلا سے کہا۔

"جانتی ہو ٹرانسسٹر کسے کہتے ہیں؟"

"یہی، جو سامنے پڑا ہے۔"

"نہیں۔" رام نے کچھ خفگی اور کچھ مسکراہٹ کے ملے جلے جذبات میں کہا۔ "سسٹر بہن کو کہتے ہیں اور ٹرانس سسٹر وہ بہن ہوتی ہے جو سگی نہ ہو، ایسے ہی بھاڑے میں لیکر بنائی ہو، اسی لئے تم بہت شور مچاتی ہو۔"

اچلا کو بہت غصہ لگا۔ "کیا مطلب؟ آپ بہن اور بھائی کے رشتے پر شک کرتے ہیں، اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"میرا مطلب ہے۔۔۔۔"

"میں سب جانتی ہوں۔" اچلا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تم مرد لوگ سب کمینے ہو، تمہاری نظروں میں کوٹ کوٹ کر غلاظت بھری ہے۔ کیا دنیا میں مرد عورت پتی پتنی بن کر ہی مل سکتے ہیں؟ کیا سنسار میں۔۔۔۔" اور اچلا کا گلا بھر آیا تھا۔ وہ روتی ہوئی کیبنٹ کے سامنے بھگوان کی تصویر کے پاس جا کر دوزانو ہوگئی اور دہائی دینے لگی۔ "میں نے کوئی بھی پاپ کیا ہو بھگوان تو میرے شریر میں کیڑے پڑیں، کوڑھ چل جائے۔"

رام اب پچھتانے لگا تھا۔ اس نے پیچھے سے آکر اچلا کو دونوں کاندھوں

سے پکڑ کر اٹھایا لیکن اچلا نے اس زور سے جھٹک دیا کہ رام دیوار کے ساتھ جا لگا۔ سر پہ معمولی سی چوٹ بھی لگی۔ اچلا اتنی تندرست تھی کہ رام گدگری ایسے اکہرے بدن والے آدمی کا اسے سنبھالنا مشکل تھا۔ پھر وہ اندر جا کر اپنے آپ کو بستر پر گرا کر اونچے اونچے رونے لگی۔ رام اب بہت ہی پچھتا رہا تھا، اور آپ جانتے ہیں پچھتائے ہوئے مرد کی کیا شکل ہوتی ہے۔ رام کی ساری شام اچی کو منانے میں لگی۔ حالانکہ وہ برلا منوہتری سبھا گھر میں ولایت حسین کی ستار سننے کے لئے جانے والا تھا اور اچلا کے لئے بھی ٹکٹ خرید کر لایا تھا، جو اب اس نے اپنی حسین مگر غصیلی بیوی کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیئے۔ پھر وہ وہیں بستر پر پڑی گھر کی اس ستار کی کمر میں بازو ڈال کر اس کے تار درست کرنے لگا۔ چونکہ استاد آدمی نہ تھا اس لئے ایک بھی سر ٹھیک نہ نکلا۔ آخر اس نے کہا بھی تو صرف اتنا "میں تم پہ اتنا سا بھی شک کروں اچے، تو کلنے کھاؤں۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں تمہارے اپنے بھائی بھی تو ہیں۔"

"کہاں ہیں" اچلا بولی "ایک کلکتہ میں رہتا ہے دوسرا جواڑہ میں۔"

"پچھواڑے میں بھائی کا ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں، ضروری ہے۔" اچی نے سر کو ایک فیصلہ کن جھٹکا دیتے ہوئے کہا "کوئی تو ہو تم سے پوچھنے والا۔"

رام گدگری پھر کچھ نہ سمجھا۔ بڑی مرگھلی سی آواز میں اس نے کہا "تمہاری مرضی، لیکن میں تو سمجھتا ہوں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تمہیں مونچھیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

مہینے ڈیڑھ کے بعد سومترا چلی آئی۔

سومترا پہلے سے واقعی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ بچے کی بھی صحت پہلے سے اچھی تھی۔

وہ کاشمیری زبان کے چند لفظ سیکھ آیا تھا جنہیں جا اور بے جا طور پر استعمال کرتا رہتا تھا۔ سومترا بار بار اسے پکڑ کر کہتی: "ڈیڈی کو یہ سناؤ، ڈیڈی کو وہ سناؤ" لیکن وہ بدمعاش وہی رٹے ہوئے فقرے دہراتا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ کشمیری زبان کی گندی گالیاں تھیں۔

موہن جام نے اچلا کی سی حماقت نہ کی۔ سومترا سے اچلا کی ملاقات کرانے سے بہت پہلے اس نے کہہ دیا تھا، 'اس نے ایک بہن بنائی ہے'۔

سومترا سنتی رہی، اسے اپنے موہن پہ پورا بھروسہ تھا۔ نہیں، وہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد کے لاابالی پن سے محبت کرتی ہیں اور یا ان کی صحت اس درجہ خراب ہوتی ہے کہ وہ محبت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتیں اور زندگی کو ہر حالت میں موت پر ترجیح دیتے ہوئے کچھ ایسے فقرے کہتی ہیں: "جھک مارتے ہیں تو مارتے پھریں"۔ اور پھر "بھگوان کو جواب انہیں دینا ہے، مجھے تو نہیں دینا"۔

آخر رات کو چپکے میں ایسی آواز میں روتی ہیں جو انہیں خود بھی سنائی نہیں دیتی۔

سومترا نے کہا بھی تو صرف اتنا: "ضرورت کیا تھی، تمہاری اپنی بہن جو ہے اس پہ سچا ادر کرو اپنا پیار" یا "ایسی ہی کوئی پیار کی باڑھ آئی ہے"۔

"ہاں" موہن نے قدرے درشتی سے کہا۔

سومترا اب گئی۔ صحت تو خراب ہونا ہی تھی، ابھی سے کیوں شروع ہو؟ اس نے جواب کے انداز میں سوال کیا: "رادھا کیسی ہے؟"

"میں تو اس سے ملا نہیں۔"

"ہائے رام! جب سے میں گئی ہوں اپنی بہن سے نہیں ملے؟"

"وقت نہیں ملا۔"

"اور وہ خود بھی نہیں آئے؟ — رادھا اور کیلاش پتی؟"

"آئے تھے، تین چار بار — لیکن میں ہی گھر پر نہ تھا۔"

سومترا کہنا چاہتی تھی: ملتے بھی کیسے، وہ تو سگی بہن تھی، بنائی ہوئی تھوڑے تھی! لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ اس کی صحت ابھی بہت اچھی نہ تھی۔

اور پھر موہن جام نے جو کہہ دیا: "جب بیس کو رکھشا کا تہوار ہے، جاؤں گا اور مل آؤں گا۔"

رکھشا کے دن موہن جام پاربل اپنی بہن رادھا کے ہاں پہنچا۔ ساتھ سومترا بھی تھی۔ رادھا یوں پر پھیلا کر لپکی جیسے برسوں کے بعد ملی ہو۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ عورت ہے اور نہ موہن کو اپنے مرد ہونے کا پتا تھا۔ اس نے رادھا کو گال سے چوم لیا۔ پھر سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر بہن کی آنکھوں سے شکایت کے آنسو پونچھے۔

کچھ دیر کے بعد رادھا بڑے مزے سے اٹھی اور لکڑی کی جالی میں سے مٹھائی کی طشتری اٹھا لائی۔ پھر چوکی سامنے رکھ کر بھائی کو بٹھایا، اس کا منہ پورب کی طرف کیا۔ جاجو، موہن کا بچہ بھی ساتھ دوسری چوکی رکھ کر بیٹھ گیا، جیسے اشٹمی کا لینکڑا ہو۔

"ارے!" رادھا نے جاجو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "پہلے تو راکھی بندھوائے گا؟"

"ہاں۔" جاجو نے گھڑا سا سر ہلا دیا۔

"پہلے تو میں اپنے بھائی کے باندھوں گی۔"

"نہیں، پہلے میرے باندھو۔"

"ایسا ہی حکم چلانا ہے۔" رادھا پیار سے بولی: "تو بھگوان سے کہہ تجھے بھی ایک بہن لادیں چھوٹی سی — جو ہر سال راکھی باندھا کرے۔"

اور ایسا کہتے میں جاجو، موہن اور کیلاش پتی تینوں نے سومترا کی طرف دیکھا، جس نے شرما کر منہ ساری میں چھپا لیا۔

رادھا نے موہن بھیا کی کلائی پہ سادہ سی مولی کی راکھی باندھی، منہ میں میٹھے کا ایک ٹکڑا ڈالا۔ موہن نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور رادھا کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ رادھا نے دس کا نوٹ اپنی آنکھوں سے لگایا اور پرارتھنا کی: "یہ دن ہر بہن کے لئے آئے بھگوان۔" اور اس کی آنکھوں میں پیار کی نمی تھی۔

سومترا اور بچے کو گھر چھوڑ کر موہن جام اجلا کے ہاں جانے کے لئے نکلا وہ سومترا کو بھی لے جانا چاہتا تھا مگر اس روز نہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔ عورتیں کئی باتوں میں مردوں کو خواہ مخواہ روکتی رہتی ہیں: "یہ نہ کرو، وہ نہ کرو!" جیسے عورتوں کی بہت سی باتیں مردوں کی سمجھ میں نہیں آتیں اسی طرح مردوں کی عورتوں کے پلے نہیں پڑتیں۔

موہن بازار میں کپڑے کی ایک دکان پہ گیا۔ بہت کچھ الٹ پلٹ کے بعد ایک بنارسی ساری ملی جس پہ ہلکی ہلکی زردوزی کی گئی تھی۔ اس کی قیمت سوا تین سو روپے طے ہوئی۔ موہن نے پیسے دیئے، ساری کو ایک خوبصورت سے گفٹ پیپر میں بندھوایا اور کاروے پر سیتہ سدن کے لئے چل نکلا۔

اجلا اپنے گھر میں بیٹھی قینچی ہاتھ میں لئے کچھ کتر بیونت کر رہی تھی جو

صبح سے ختم ہی نہ ہوتی تھی۔ رام گدگری کھڑکی میں کھڑا یوں ہی بازار میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور نیچے ٹیلر ماسٹر کی دکان پہ آتے جاتے ہر آدمی کے سر پہ اپنے سگریٹ کا گل جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبھی سامنے موہن جام کی کار آ کر رکی۔

پیچھے ہٹتے ہوئے رام گدگری نے آواز دی: "اچی۔"

"جی۔" اچی نے بڑی مٹھاس سے جواب دیا۔

"وہ آیا ہے۔"

"کون وہ۔ بھیا جی۔"

"بھیا جی نہیں، مچلا۔"

"مچلا؟"

"ہاں، تو اچلا ہے نا، اور وہ مچلا۔"

جب تک موہن دروازے پہ آ چکا تھا، گھنٹی بجا چکا تھا، روزی اسے دروازہ کھول چکی تھی۔

رام گدگری کا خیال تھا موہن اس دن نہیں آئے گا۔ اگر وہ رکھشا بندھن کے لئے آ گیا تو پھر وہ کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتا۔ پھر تو ــــ سب ٹھیک ہے۔ اور موہن آ گیا تھا۔ جس کے لئے اچی صبح ہی سے کلابتون اور جھل مل اور نہ جانے کن کن چیزوں کی ایک خوبصورت راکھی بناتی رہی تھی۔ رادھا کی غریبانہ، مولی کے دھاگے کی راکھی تو موہن نے اتار کر کہیں پھینک دی تھی اور اب ــــ اس کی کلائی پہ کچھ بھی نہ رہا تھا۔ موہن کے آتے ہی اچلا ہمیشہ کی طرح بد کھلا کر اٹھی اور بھاگ کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور اس کی یوں آؤ بھگت کی جیسے کوئی کسی راجہ کی کرتا ہے۔

رام گدکری ہمیشہ کی طرح سمجھ رہا تھا اور نہیں بھی سمجھ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں موہن جام پورب کی طرف منہ کئے پیڑھی پہ بیٹھا تھا اور رام گدکری کچھ پرے بے اعتنائی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

جبھی اچلا آئی۔ اس نے ایک بہت خوبصورت قمیص اور شلوار پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں پیاز کے چھلکے کی طرح کا ایک دوپٹہ تھا جس نے اچی کے گلے اور سینے کو صحت کا رنگ دے دیا تھا۔ فٹ سی قمیص نے چھاتی، کمر اور نچلے حصے کی بہت ہی خوبصورت حدبندیاں کر رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں تھالی تھی جس میں رکھی ہوئی مٹھائی پہ سونے کے ورق کانپ رہے تھے اور اس کے ایک طرف راکھی تھی جس کی جھلمل میں کچھ سچے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔

موہن نے بڑی محبت سے ہاتھ بڑھایا اچلا نے جب موہن کی کلائی پہ راکھی باندھنا شروع کی تو رام گدکری کو اس کے ہاتھ خوشی سے کانپتے ہوئے دکھائی دیئے۔ پھر موہن نے مٹھائی کے ٹکڑے کے لئے منہ کھولا اور اچلا نے اس میں قلاقند رکھ دیا۔ جبھی موہن نے گفٹ پیپر کھولا اور اس میں سے ساری نکالی اس پہ سو روپے کا نوٹ رکھا اور دونوں چیزیں اچلا کی طرف بڑھا دیں۔

رام گدکری کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے پھیلیں اور پھر معمول کی سی ہو گئیں۔

رکھشا کی یہ رسم ادا کرنے میں اچلا بھی خاموش تھی اور موہن بھی۔ دونوں کے بدن میں ایکا ایکی کہیں ہاتھ چھو جانے سے ایک بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ پھر اچلا نے دھیمی سی آواز میں کہا "یہ دن بار بار آئے بھگوان"۔ اور جب موہن نے اچلا کی آنکھوں میں دیکھا تو ان میں حیا کی سرخی تھی۔

کچھ دیر یونہی سی گفتگو کے بعد موہن نے رام گدکری سے ہاتھ ملایا، اچلا سے نمستے کی اور چل دیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ایک آہ

بھری جسے کسی نے نہ دیکھا۔ پھر وہ نیچے کی طرف چل دیا۔

اچلا ہمیشہ کی طرح اسے نیچے چھوڑنے کے لئے جانا چاہتی تھی۔ لیکن آج اس کے پیر جواب دے گئے تھے۔

"تمہیں خوش ہونا چاہئے اچی"، رام نے کہا۔ "بھائی کو راکھی باندھی ہے۔"

"ہاں"، اچی نے کہا۔ "آج صبح ہی سے میری طبیعت کچھ۔۔۔۔۔"

"صبح ہی سے تو یہ سب بناتی رہی ہو، سب اکٹھا کرتی رہی ہو۔۔۔۔"

اچلا نے سر ہلا دیا۔ رام نے آگے بڑھ کر کہا۔ "میں تو سمجھتا تھا تم اپنے بھائی کی دی ہوئی ساری پہن کر مجھے دکھاؤ گی۔"

اچی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں بند سی ہوتے دیکھ کر رام گدگری نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا اور بڑے پیار سے بولا۔ "کیا ہو گیا میری اچو کو۔"

"کچھ نہیں۔" اچو نے ایک دھیمی سی آواز میں کہا اور پھر اپنا بازو رام کے گرد ڈالتے ہوئے بولی۔ "مجھ سے پیار کرو۔"

رام نے اچی کو سینے سے لپٹا لیا اور بھینچنے لگا۔

"اور ـــــ" اچی نے کہا۔

اس کے بعد اچی کی آنکھیں بند تھیں اور منہ کھلا ہوا۔ جب تک موہن جام اچلا اور رام گدگری کے خیالوں سے بھی پرے جا چکا تھا۔

●

جوگیا

نہا دھو کر، نیچے کے تین ساڑھے تین کپڑے پہنے، جوگیا روز کی طرح اس
دن بھی الماری کے پاس آکر کھڑی ہوئی، اور میں اپنے ہاں سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر
دیکھنے لگا۔ ایسے میں دروازہ کو ہاتھ جو لگا تو "چوں" کی ایک بے سُری آواز پیدا
ہوئی۔ بڑے بھیا جو کہیں پاس ہی بیٹھے شیو بنا رہے تھے، مڑ کر بولے۔

"کیا ہے جنگل"؟

"کچھ نہیں موٹے بھیا"، میں نے انہیں ٹالتے ہوئے کہا: "گرمی بہت ہے"۔
اور پھر میں سامنے دیکھنے لگا ــــ ساری کے سلسلے میں آج جوگیا کونسا
رنگ چنتی ہے؟

میں جے جے اسکول آف آرٹس میں پڑھتا تھا۔ رنگ میرے حواس پر
چھائے رہتے تھے۔ رنگ مجھے مرد عورتوں سے زیادہ ناطق معلوم ہوتے تھے
اور آج بھی ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ اکثر بے معنی باتیں کرتے
ہیں لیکن رنگ کبھی معنی سے خالی بات نہیں کرتے۔

ہمارا مکان کالیا دیوی کی وادی شیٹ اگیاری لین میں تھا۔ پارسیوں

کی اگیاری تو کہیں دور گلی کے موڑ پر تھی۔ یہاں پر صرف مکان تھے۔ آمنے سامنے اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ ان مکانوں کی ہم آغوشیاں کہیں تو ماں بچے کے پیار کی طرح دھیمی دھیمی، ملائم ملائم اور صاف ستھری تھیں اور کہیں مرد عورت کی محبت کی طرح مجنونانہ ---- سینہ بہ سینہ، لب بہ لب، غلیظ اور مقدس۔

سامنے پانچو گھر کی قسم کے کمروں میں جو کچھ ہوتا تھا وہ ہمارے ہاں گیان بھون سے صاف دکھائی دیتا ---- ابھی بجور کی ماں ترکاری چھیل رہی ہے اور چاقو سے اپنا ہی ہاتھ کاٹ لیا ہے۔ ڈنکر بھائی نے احمد آیا سے گھی اور تیل کے دو پیسے منگوائے ہیں اور پنجابن سب کی نظریں بچا کر انڈوں کے چھلکے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک کر چلی ہے۔۔۔۔ جیسے ہمارے گیان بھون سے ان لوگوں کا کھایا پیا سب نظر آتا تھا ویسے ہی انہیں بھی ہمارا سب کچھ نظر آتا ہوگا۔

جوگیا کے گھر کا نام تو پھوڑ نواس تھا لیکن میں اسے پانچو گھر کی قسم کا اس لئے کہتا ہوں کہ اس میں عام طور پر بدھوائیں اور چھوڑی ہوئی عورتیں رہتی تھیں جن میں سے ایک جوگیا کی ماں تھی جو دن بھر کسی درزی گھر میں سلائی کی مشین چلاتی اور اس سے اتنا پیسہ پیدا کر لیتی کہ جس سے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پال سکے اور ساتھ ہی اس کی تعلیم بھی مکمل کر سکے۔

جوگیا سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ قد کوئی ایسا چھوٹا نہ تھا لیکن بدن کے بھرے پڑے اور گٹھے ہونے کی وجہ سے اس چھوٹا ہونے کا گمان گذرتا تھا۔ کسی کو یقین بھی نہ آسکتا تھا کہ جوگیا دال رنگتا اور ہفتے میں ایک آدھ بار کی ستری کھنڈے اتنی تندرست ہو سکتی۔

بہرحال ان لڑکیوں کا کچھ مت کہیے جوگی کھاتی ہیں الم غلم ان کے بدن کو لگتا ہے اور بعض وقت تو غلط حصوں کو لگتا ہے جنہیں میں تو صحیح کہتا ہوں کیونکہ عورت کے جسم میں پتلے پتلے، پیلے پیلے خطوط کی بہ نسبت مجھے گھرے گھرے اور بھر پور خط اچھے لگتے ہیں۔ جوگیا کا چہرہ سومنات مندر کے پیش رخ کی طرح چوڑا تھا جس میں قندیلوں جیسی آنکھیں، رات کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کو روشنی دکھاتی تھیں۔ مورتی میں ناک اور ہونٹ زمرد اور یاقوت کی طرح ٹکے ہوئے تھے، سر کے بال کمر سے نیچے تک کی پیمائش کرتے تھے جنہیں کبھی وہ ڈھیلا ڈھیلا اور بھیگا بھیگا رکھتی اور کبھی اس قدر کس کے بنا دیتی کہ ان کی کچھ لٹیں باقی بالوں سے خواہ مخواہ الگ ہو کر چہرے اور گردن پر مچلتی رہتیں۔ اس کا چہرہ کیا تھا، پورا تارا منڈل تھا جس میں چاند خیالوں اور جذبوں کے ساتھ گھٹتا اور بڑھتا رہتا تھا۔ جوگیا یوں بڑی بھولی تھی لیکن اپنے آپ کو سجانے بنانے کے سلسلے میں بہت چالاک تھی۔ کب اور کس وقت اور کیا کرنا ہے، یہ وہی جانتی تھی اور اس کے اس جاننے میں اس کی تعلیم کا بڑا ہاتھ تھا جس نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ گڑبڑ تھی تو صرف رنگ کی کیونکہ جوگیا کا رنگ ضرورت سے زیادہ گورا تھا جسے دیکھتے ہی زکام کا سا احساس ہونے لگتا۔ اگر باقی چیزیں اتنی متناسب نہ ہوتیں تو بس چھٹی ہو گئی تھی۔

میں نہیں جانتا محبت کس چڑیا کا نام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوگیا کو دیکھتے ہی میرے اندر کوئی دیواریں سی گرنے لگتی تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے جوگیا بھی مجھے دیکھ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتی۔ جوگیا میری بھتیجی ہیما کی سہیلی تھی عجیب پہیلی پیا تھا۔ کیونکہ ہیما صرف سات سال کی تھی اور جوگیا اٹھارہ برس

کی۔ ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی جیسے صرف جوگیا جانتی تھی اور یا پھر میں جانتا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی صرف یہی سمجھتے تھے کہ وہ ہیما سے پیار کرتی ہے اس لئے اسے پڑھانے آتی ہے۔ یوں ہمارے گھر میں آکر جوگیا سب کو سبق دے جاتی تھی۔ میں جو ایک آرٹسٹ بننے جا رہا تھا، ایسے رکھ رکھاؤ کی باتوں کا قائل نہ تھا لیکن میری مجبوریاں تھیں۔ میں نے کمانا شروع نہیں کیا تھا اور میرے ہر قسم کے خرچ کا مدار موٹے بھیا پر تھا۔ البتہ بیچ بیچ میں مجھے اس بات کا بھی خیال آتا تھا کہ اس داؤ گھات میں بھی ایک مزہ ہے۔ مغرب میں لڑکے اور لڑکیاں جو اتنی آسانی سے ایک دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں بنا کسی التہاب کے ایک دوسرے کی آغوش میں چلے آتے ہیں، خاک لطف اٹھاتے ہیں۔ اتفاقاً محبوبہ کے بدن سے چھو جانے پر ان کے اندر تو کوئی بجلی نہ دوڑتی ہوگی۔ شاید ان کو کوئی ایسا لطف آتا ہو جو ہمارے لطف سے ارفع ہو لیکن ہمارے ہاں صرف لمس اور ادھر ادھر کی باتوں ہی میں ایسے تلذذ کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے وصال میں بھی کیا ہوگا۔

یوں ہی دو چار بار میرا ہاتھ جوگیا کے پنڈے کو لگ گیا ہوگا۔ ایک بار، صرف ایک بار میں نے اپنے ارادے سے جوگیا کا منہ چوما تھا۔

ہم گھر سے تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے کے ساتھ نکلتے تھے اور پھر پارسیوں کی اگیاری کے پاس مل جاتے۔ ہمارے اس راز کو صرف وہ پارسی بچارہ ہی جانتا تھا جو فرشتوں کے لباس میں اگیاری کے باہر بیٹھا ہوتا اور منہ میں ژندا وستا پڑھتا رہتا تھا۔ وہ، صرف وہ ہمارے سرور کو سمجھتا تھا۔ اس لئے اس کے پاس سے گذرتے ہوئے ہم اسے "صرف دا صاحب جی" کہتے اور پھر اس راستے پر چل پڑتے جو دنیا کے ہو و لعب، میٹر و سنیما کی طرف جاتا تھا جہاں

پہنچکر جوگیا اپنے کالج کی طرف چل دیتی اور میں اپنے اسکول کی طرف۔ راستے بھر ہم غیر متعلق باتیں کرتے اور ان سے پورا حظ اٹھاتے۔ اگر پیار کی باتیں ہوتیں بھی تو کسی دوسرے کے پیار کی جن میں وہ مرد کو ہمیشہ بدمعاش کہتی اور اس بات پر کڑھتی بھی کہ اس کے بغیر بھی گذارہ نہیں۔ ایک دن جہاں گیر آرٹ گیلری میں کسی آرٹسٹ کی منفرد نمائش تھی اور پورے شہر بمبئی میں سے کوئی بھی اس بدنصیب کی تصویروں کو دیکھنے اور خریدنے نہ آیا تھا صرف میں اور جوگیا پہنچے تھے اور وہ بھی تصویریں دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے، محسوس کرنے کے لئے۔ پورے ہال میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا اور تین طرف سے رنگ ہمیں گھور رہے تھے: "جوہو میں ایک صبح" کے نام کی ایک بڑی سی تصویر تھی جس میں اوپر کے حصے پر برش سے گہرے سرخ رنگ کو موٹے موٹے اور بھدے طریقے سے تھوپا اور سجایا گیا تھا۔ جس نے ہماری روحوں تک میں التہاب پیدا کر دیا۔ اس تصویر کے نیچے ایک اسٹول سا پڑا تھا جس پر جوگیا کسی اندرونی تکان کے احساس سے بیٹھ گئی۔ اس کی سانس قدرے تیز تھی اور میں جانتا تھا محبت میں ایک قدم بھی بعض اوقات سینکڑوں فرسنگ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اور آدمی چلنے سے پہلے ہی تھک جاتا ہے۔

آرٹسٹ روہانسا ہو کر باہر چلا گیا تھا ۔۔۔ دیکھتے کوئی آتا ہے یا نہیں۔ اپنی نفرت میں وہ ہماری محبت کو نہ دیکھ سکا تھا۔

جبھی ہم دونوں کے اکیلے پن نے سارے ہال کو بھر دیا تھا۔

اس دن میں نے جوگیا سے سب کہہ دینا چاہا۔ ہم دونوں ہی پیار کی ہیرا پھیریوں سے تنگ آچکے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا، ٹھٹھکا اور پھر اسٹول کے پاس، جوگیا کے عین پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں کہہ بھی سکا تو بس اتنا "جوگیا! میں تمہیں ایک لطیفہ سناؤں؟"

"سامنے آکے سناؤ۔" جوگیا بولی۔

میں نے کہا "لطیفہ ہی ایسا ہے۔"

میری طرف دیکھے بغیر ہی اسے میرے حیص بیص کا اندازہ ہو رہا تھا اور مجھے پیچھے اس کے کانوں کی لوؤں سے اس کی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی

آخر میں نے لطیفہ شروع کیا۔

"ایک بہت ہی ڈرپوک قسم کا پریمی تھا۔"

"ہوں۔" جوگیا کے سنبھلنے ہی سے اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"وہ کسی طرح بھی اپنی پریمیکا کو اپنا پیار نہ جتا سکتا تھا۔"

اس پر جوگیا نے تین چوتھائی میں میری طرف دیکھا — "تم لطیفہ سنا رہے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے کچھ خفیف ہوتے ہوئے کہا۔

اور جوگیا پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی — منتظر۔۔۔ ایک ایسا انتظار جو بہت ہی لمبا ہو گیا تھا جس میں لمحات کے شرارے کسی بارود سے چھوٹ چھوٹ کر نکل رہے تھے، خلا میں پھٹ رہے تھے اور آخر معدومیت کا حصہ ہوتے جا رہے تھے جبھی "جوہو میں ایک صبح" میں لال رنگ کے بیچ سے سورج کی کرن نیچے سمندر کی سیاہیوں میں ڈوبتی ہوئی کشتی پر پڑی اور میں نے کہا: وہ لڑکی اپنے پریمی سے تنگ آ گئی۔ آخر اس نے سوچا اس بیچارے میں تو ہمت ہی نہیں، کیوں نہ میں اسے ایسا موقع دوں، شاید۔۔۔ چنانچہ اس نے اپنے جنم دن پر لڑکے کو بلایا۔ لڑکا آیا بھی، گلدستہ بھی لایا، جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی پریمیکا نے کہا — "ہئے کتنا پیارا ہے، یہ اودے میں گلابی، گلابی میں سفید رنگ کے پھول۔۔۔ ان کے بدلے میں تو کوئی میرا منہ بھی چوم لے۔"

"پھر؟" جوگیا کی بے صبری پیچھے سے بھی دکھائی دے رہی تھی —

پھر — لڑکی نے اپنا منہ تھوڑا آگے کر دیا مگر ۔ ۔ ۔ وہ لڑکا باہر جا رہا تھا، دروازے کی طرف ۔"

"ہائے بھگوان ۔" اور جوگیا نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مار لیا ۔

میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "لڑکی بولی ۔ کہاں جا رہے ہو، لالی ہا ۔ ۔ ۔ جس پر لالی نے دروازے کے پاس مڑتے ہوئے کہا" اور پھول لینے ۔ ۔ ۔ "

اس سے پہلے کہ جوگیا ہنستی اور اس کا انتظار ادبیت پر چھا جاتا، میں نے پیچھے سے اس کے دونوں بازو جکڑ کر اس کا منہ چوم لیا تھا ۔ اب جوگیا بناوٹی غصے سے مجھے ہلکے ہلکے تھپڑ لگا رہی تھی اور اپنے ہونٹ پونچھ رہی تھی ۔ وہ ہنس نہ سکتی تھی کیونکہ وہ ناراض تھی اور خوش تھی ۔ محبت کے اس بے برگ و گیاہ سفر میں ایک ایکی زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا چلا آیا تھا جسے بارش کے چھینٹوں نے ہرا ابھرا کر دیا تھا ۔ ۔ ۔ اس دن اگر ہم جوشیلے، سرخ رنگ کی تصویر کے نیچے کھڑے نہ ہوتے تو میں جوگیا کا منہ نہ چوم سکتا تھا ۔ اس کے بعد آرٹ کا دلدادہ کوئی آدمی آیا اور اس نے بازو والی تصویر خرید لی جس کا نام تھا "کوئی کسی کا نہیں ۔" اور جس میں ایک عورت سر ہاتھوں میں دیئے رو رہی تھی ۔ سب رنگوں میں اداسی تھی اور وہ ایسے وقت میں اداسی کے رنگ خرید رہا تھا جبکہ سب کھلتے ہوئے رنگ ہمارے تھے ۔ جیب میں ایک پائی نہ ہونے کے باوجود سب تصویریں ہماری تھیں، نمائش ہماری تھی ۔ جوگیا ایک عظیم تشفی کے احساس سے معمور باہر دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی، جہاں سے اس نے ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا، مکا دکھایا، مسکرائی اور دوڑ گئی ۔ ۔ ۔

کچھ دیر یوں ہی ادھر ادھر رنگ اچھالنے کے بعد میں بھی باہر چلا آیا

دنیا کی سب چیزیں اس روز اجلی اجلی دکھائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ایسے ہی رنگوں کے نام اودا، پیلا، کالا اور نیلا وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو خیال بھی نہیں آیا، ایک رنگ ایسا بھی ہے جو ان کی جمع تفریق میں نہیں آتا، اور جسے اجلا کہتے ہیں اور جس میں دھنک کے ساتوں رنگ چھپے ہوئے ہیں۔ ... میرا گلا تشکر کے احساس سے رندھا ہوا تھا ــــ میں کس کا شکریہ ادا کر رہا تھا؟ ... اس ایک لمس سے جو گیا ہمیشہ کے لئے میری ہو گئی تھی۔ میں جیسے اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی کے ساتھ بیاہ بھی کر لیتی، کسی کے ساتھ سو بھی جاتی، جب بھی وہ میری تھی۔ ایسا چھن جس میں سچائی ہو، ولولہ ہو، بدنصیب شوہر کو کہاں ملتا ہے۔

تو گویا میں اس دن دیکھ رہا تھا کون سے رنگ کی ساری جوگیا اپنی الماری میں سے نکالتی ہے۔ اگر وہ مجھے میرے ہاں کے دروازے کے پیچھے دیکھ لیتی تو ضرور اشارے سے پوچھتی۔ آج کون سی ساری پہنوں اور اس میں سارا مزہ کرکرا ہو جاتا میں تو جاننا چاہتا تھا، صبح سویرے نہا دھو کر جب کوئی سندری اپنی ساریوں کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے تو اس میں کونسی چیز ہے جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے ــــ آج گلابی رنگ کی ساری پہننی چاہیئے۔ ان عورتوں کے سوچنے کا طریقہ بڑا پراسرار ہے اور پُرپیچ۔ اتنا بھید، اتنا رہسیہ کہ مرد اس کی تھاہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ سنا ہے چاند نہ صرف عورتوں کے خون بلکہ اس کے سوچ بچار پر بھی اثر انداز ہوتا ہے لیکن چاند کا اپنا تو کوئی رنگ ہی نہیں، روشنی ہی نہیں، وہ تو سب سورج سے مستعار لیتا ہے... جبھی... جبھی ساری پہننے سے پہلے عورت ہمیشہ اپنے کسی سورج سے پوچھ لیتی ہے ــــ آج کون سی ساری پہنوں؟

نہیں، نہیں ۔۔۔ ۔ اس کا اپنا رنگ ہے، اپنا فیصلہ۔ ہر کسی کو کوئی مرد تھوڑا ہی بتانے جاتا ہے۔ پھر رات کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے، اس کا اپنا رنگ ۔۔۔ ۔۔۔

اس دن واقعی بہت گرمی تھی۔ نیچے وادی شیٹ اگیاری لین میں آتے جاتے لوگ ریت کے رنگ کی سڑک پر سے گذرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ بھٹیارن دانے بھون رہی ہے جبھی کوئی پنجابی یا مارواڑی بڑا سا پگڑ باندھے آتا تو اوپر سے بالکل مکی کا دانہ معلوم ہوتا جو بھٹی کی آنچ میں پھول کر سفید ہو جاتا ہے ۔۔۔ ۔۔۔

یہاں گیان بھون سے مجھے صرف رنگ کے چھینٹے دکھائی دیتے وہ سب ساریاں تھیں جن میں سے ایک جوگیا اپنے لئے، میرے لئے، ساری دنیا کے لئے چن رہی تھی۔ یوں ہی اس نے ایک بار میرے گھر کی طرف دیکھا، شاید اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن میں نے تو کسی اوٹ کی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی جس سے میں تو ساری دنیا کو دیکھ سکتا تھا لیکن دنیا مجھے نہ دیکھ سکتی تھی۔ اس دن واقعی میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا جوگیا نے ہلکے نیلے رنگ کو چنا ہے۔ ایسی گرمی میں یہی ٹھنڈا رنگ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اگر میں ہوتا تو جوگیا کو یہی رنگ پہننے کا مشورہ دیتا۔ جبھی میں نے سوچا ۔۔۔ میں نے چھپنے کی بہت کوشش کی لیکن جوگیا نے اپنے سایہ میں بلا کر مجھ سے پوچھ ہی لیا ہے۔

پھر وہی شروع کی جدائی اور آخر کا میل۔ معلوم ہوتا تھا اگیاری تک یہ دنیا اور اس کے قانون ہیں، اس کے بعد کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔

میں نے بڑھ کر جوگیا کے پاس پہنچتے ہوئے کہا "آج تم نے بڑا پیارا رنگ چنا ہے، جوگی۔ ۔ ۔ ۔"

"میں جانتی تھی تم اسے پسند کرو گے۔"

"تم کیسے جانتی تھیں؟"

"ایسے ہی ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی کبھی تمہارا من میرے من میں آجاتا ہے۔"

"ہوں" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "آج تمہیں چھونے، ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔"

"کیا جی چاہتا ہے؟"

اس وقت ایک وکٹوریہ ہم دونوں کے بیچ آگئی جس سے نکلنے میں صدیاں لگیں۔ میری نگاہیں پھر جھیلوں میں تیرتے ہیجنٹے اڑانے لگیں جب تک ہم پرنس اسٹریٹ کا چوراہا پار کر کے ہیٹر وکے پاس آچکے تھے، جہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے تھے۔ میں نے کہا: "آج جی چاہتا ہے سر تمہارے پیروں پر رکھ دوں اور روؤں۔"

"روؤ ۔۔۔ کیوں؟"

"شاستر کہتے ہیں آتما کے پاپ رونے ہی سے دھل سکتے ہیں۔"

"کون سا پاپ کیا ہے تمہاری آتما نے؟"

"ایسا پاپ جو میرا اشتریہ نہ کر سکا۔"

ایسی باتوں کو عورتیں بالکل نہیں سمجھ سکتیں اور یا پھر ضرورت سے زیادہ سمجھ جاتی ہیں، جوگیا نہ سمجھ سکی۔ اپنا ہی کوئی بچار اس کے من میں چلا آیا تھا "جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے؟"

"کیا ۔۔۔ کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"چاہتا ہے۔" اور اس نے اپنی ہلکے نیلے رنگ کی ساری کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہیں اس میں چھپا کر ان امبروں پر اڑ جاؤں، جہاں سے آ پی واپس آؤں، نہ تمہیں آنے دوں۔" اور یہ کہتے ہوئے جوگیا نے ایک بار اوپر ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کی طرف دیکھا جہاں سے کبھی وہ آئی تھی۔

میں کچھ دیر کے لئے وہیں تھم گیا اور ان خوش نصیبوں کے بارے میں سوچنے لگا جنہیں جوگیا ایسی سندریاں اپنے دامن میں چھپا کر امبروں پہ لے گئی ہیں جہاں سے وہ خود آئی ہیں اور نہ انہیں آنے دیا ہے۔ خدا کبھی ان کے پاس سے گذرتا ہے تو ایک سرد آہ بھر کر چلا جاتا ہے۔

مڑ کے دیکھا تو جوگیا جا چکی تھی۔

امبر تو کہاں، جوگیا مجھے تپتی ہوئی زمین اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کے ایک طرف یتیم اور لاوارث چھوڑ گئی تھی جس کا احساس مجھے خاصی دیر کے بعد ہوا۔ حدت سے پھٹتی ہوئی سڑک کی دراڑوں میں گھوڑا گاڑیوں کے بڑے بڑے پہیے پھنس رہے تھے اور ان کے ڈرائیور پیشانیوں پر سے پسینہ پونچھتے ادھر ادھر تبرے سناتے ہوئے آجا رہے تھے۔ جبھی میں نے دیکھا خنک آب کی سی کوئی موج چلی آ رہی ہے۔ وہ کوئی اور جوان لڑکی تھی۔ لانبی اونچی، باب کٹے ہوئے بال، جو ہلکے نیلے رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔

چند قدم اور آگے گیا تو ایک نہیں دو، تین، چار عورتیں ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے شاپنگ کرتی پھر رہی تھیں۔

یہ تجربہ مجھے پہلی بار نہیں ہوا تھا، اس سے پہلے بھی ایک بار کرافورڈ مارکیٹ کے علاقے میں آنے جانے والی عورتوں نے دھانی لباس پہن رکھا تھا فرق تھا تو صرف اتنا کسی کی اوڑھنی دھانی تھی اور کسی کی ساری، اسکرٹ

بھی دھانی تھے اور میں سوچتا رہ گیا تھا۔ سویرے جب یہ عورتیں نہا دھو کر بالوں کو چھانٹتی بناتی ہوئی کپڑوں کی الماری کے پاس پہنچتی ہیں تو ان میں کون سی بات، کون سا ایسا جذبہ ہے جو انہیں بتا دیتا ہے ۔۔۔ آج مولسری پہننا چاہئے ؛ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک دن کوئی نارنجی رنگ استعمال کرتی ہے تو پھر اس سے اس کی طبیعت اوب جاتی ہے۔ پھر دوسرے دن اس کا ہاتھ اپنے آپ کسی دوسرے رنگ کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ مثلاً سرسوں کا سا پیلا رنگ، چمپئی رنگ، گل اناری، کاسنی، فیروزی ۔۔۔۔ لیکن ۔۔۔ وہ کونسا بے تار برقی کا عمل ہے جس سے وہ سب کی سب ایک دوسری کو بتا دیتی ہیں اور پھر ایکا ایکی پورا بازار، پورا راستہ ایک ہی رنگ سے بھر جاتا ہے۔ شاید یہ موسم کی بات ہے یا ویسے ہی چاند کی، بادل کی.. .. شاید کوئی مروجہ فیشن، کسی ایکٹریس کا لباس ہے جو ان کے انتخاب میں دخل رکھتا ہے ۔۔۔۔ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں بعض اوقات وہ رنگا رنگ کپڑے بھی پہنتی ہیں اور کیا کچھ مرد کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیتی ہیں۔

اس دن سب کی ساریاں ہلکے نیلے رنگ کی دیکھ کر میری آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ سمجھ کا شمہ بھر بھی دماغ میں نہ گھس سکتا تھا، جبکہ میں اسکول پہنچا، ایک کلاس ختم ہو چکی تھی اور لڑکے لڑکیاں باہر آ رہے تھے کچھ آ کر کمپاؤنڈ میں گل مہر کے نیچے کھڑے ہو گئے۔

ان میں سوکیشی بھی تھی۔ اس کے اسکرٹ کا بھی رنگ نیلا تھا۔

اگر ہیمنت، میرا دوست وہاں نہ مل جاتا تو میں پاگل ہو جاتا ہیمنت یوں تو خزاں کو کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں وسنت تھا ۔۔۔ بہار، جو

اس پر ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔ دنیا بھر میں کہیں، کسی جگہ بھی ایک ہی موسم نہیں رہتا اور نہ ایک رنگ رہتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک ہی سی مستی اور تضحیک رہتی تھی جس کے کارن ہم اسے کہا کرتے تھے ــــ سالے! چاہے وہاں کا زور لگالے تو کبھی آرٹسٹ نہیں بن سکتا ــــ کیا تجھ پر گریبان پھاڑ کر باہر بھاگ جانے کی نوبت آئی ہے؟ بے بسی میں تشنجی ہاتھ تو نے ہوا میں پھیلائے ہیں اور اپنے بال نوچے ہیں؟ کیا تیرے بدن پر ایکا ایکی لاکھوں ٹڈے رینگے ہیں؟ رات کے وقت اندھیرے میں چمگادڑ تجھ پر جھپٹتے ہیں اور اپنا منہ تیری شہ رگ سے لگا کر تیرا خون چوسا ہے؟ کیا تو اس وقت بچوں کی طرح رویا ہے، جب تیری تصویر انعامی مقابلہ میں اول آئی ہو؟ کیا تجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ماں باپ ہوتے ہوئے بھی تو یتیم ہے اور دوست ایک ایک کر کے تجھے اندھے کنوئیں میں دھکیل کر چل دیئے ہیں؟ کیا تو نے جانا ہے جس منصور کو سولی پر چڑھایا گیا تھا وہ تو تھا۔ تیرے چہرے پر سیاہیاں چھٹی ہیں اور تیرے خد و خال اتنے سخت، گھناؤنے اور طاقتور ہوئے ہیں جتنے میکسیکو کے میورلز؟ کیا تجھے ہر لمبوتری چیز ایک لنگ اور ہر بیڑ پر کی گانٹھ یونی معلوم ہوئی ہے جس سے متوحش ہو کر۔۔۔

آج پھر میں نے اسے بتایا ــــ شہر کی سب عورتیں ہلکا نیلا پہنے نکل آئی ہیں ہیمنت نے اپنے دانت دکھا دیئے اور حسب معمول میرا مذاق اڑانے لگا۔ وہ مجھے ساون کا اندھا سمجھتا تھا جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے۔ میں نے سوکیتی کی طرف اشارہ کیا جسے ہم ماڈل کہا کرتے تھے۔ وہ آج تک کسی کی ماڈل نہ بنی تھی۔ لیکن اس کے بدن کے خطوط بالکل ویسی لڑکیوں کے تھے، میں نے کہا، "دیکھو آج یہ بھی ہلکے نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنے ہوئے ہے۔"

ہیمنت نے مجھے کچھ نہ کہا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمپاؤنڈ سے لان پر لے آیا

جو پام کے پیڑوں سے پٹا پڑا تھا۔ وہاں ایک کنارے پر پہنچکر وہ پارک کے پیچھے کھڑا ہو گیا جہاں سے سامنے سڑک دکھائی دیتی تھی۔ ایک راستہ کرافورڈ مارکیٹ کی طرف جاتا تھا اور دوسرا وکٹوریہ ٹرمینس اور ہارن بی روڈ کی طرف۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا یہ سب میرا وہم ہے۔ وہاں پہنچے تو کوئی عورت ہی نہ تھی۔ اگر عورتیں اپنے اپنے مردوں کو ہلکے نیلے رنگ کی ساریوں میں چھپا کر اوپر امبروں پر اڑ گئی ہوتیں تو وہاں مرد نظر نہ آتے ـــــ لیکن ـــــ چاروں طرف مرد ہی مرد تھے اور وہ یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے کبھی کسی عورت سے انہیں سروکار ہی نہ تھا۔ کوئی لانبا تھا اور کوئی ناٹا، کوئی خوبصورت اور کوئی بدصورت اور توندیلا۔ اور وہ سب بھاگ رہے تھے جیسے انہیں کسی عورت کو جواب نہیں دینا ہے۔ جبھی ادھر سے جیسے لوہے کی بنی ہوئی گھاٹن گذری جس نے ہرے رنگ کا کاشٹا لگا رکھا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہیمنت بولا ـــــ "پہچان اپنی ماں کو۔۔۔"

میں نے بیکار کی عذرداری کی ـــــ "میں ان بیچاری غریب مزدور عورتوں کی بات نہیں کرتا۔"

"کن کی کرتے ہو؟"

"ان کی، جن کے پاس کپڑے تو ہوں۔"

جبھی میری بدقسمتی سے ایک سیڈان، سامنے پارسی دارو والے کے ہاں رکی۔ اس میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اس جماعت کی نمائندہ تھی جن کے پاس نہ صرف کپڑے ہوتے ہیں بلکہ بے شمار ہوتے ہیں اور رنگ اتنی انواع کے کہ وہ بوکھلا جاتی ہیں۔ اسی لئے جب وہ اپنے وارڈروب کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں تو انہیں سندریوں کا وہ بے تار برقی کا پیغام نہیں آتا۔ ان کی حالت اس خریدار کی طرح ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی دکاندار انواع و اقسام

کا ڈھیر لگا دے اور ان میں سے کچھ بھی نہ جچ سکیں۔ وہ عورت خوب لمبی تھی موٹی تھی اور اس نے ایک شعلہ رنگ ساری پہن رکھی تھی۔ پچاس نیٹ چوڑی سڑک کے اس پار سے مجھے اس کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی۔ لیکن اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ باہر آگ برس رہی ہے جس میں ایسا شعلہ سا رنگ نہ چلے گا۔

اس عورت کا نوکر جو تھوڑی دیر پہلے پرمٹ کے کاغذ سنبھالتا ہوا اندر گیا تھا، ایک ٹوکری میں کچھ وہسکی اور چند بیئر کی بوتلیں رکھے ہوئے باہر چلا آیا اور ڈکی کھول کر اس میں رکھنے لگا۔ جب تک میں ہیمنت کے سامنے خفیف ہو چکا تھا اپنی خفت کو چھپانے کے لئے میں نے کہا۔

"یہ بیئر کی بوتلیں۔۔۔۔۔ کم از کم اس کے مرد کو تو گرمی لگتی ہے۔"

ایسے ہی میں ہیمنت کے سامنے کئی بار شرمندہ ہوا۔ ایک آدھ بار مجھے اسے شرمسار کرنے کا موقع مل گیا جب کہ سب عورتیں سرمئی ساریاں پہنے سڑک پر چلی آئی تھیں۔ مجھے ہمیشہ ان کے رنگ ایک سے لگتے تھے لیکن جب ہیمنت میرا کان پکڑ کر مجھے باہر لاتا تو وہ سب الگ الگ دکھائی دینے لگتے۔ آخر میں نے اسے اپنے دل کا واہمہ سمجھ کر ان باتوں کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

لیکن ـــ وہ چھوٹتا کیسے، ایک دن جو گیا نے کالے بلاؤز اور خاکستری رنگ کی ساری کا بیحد خوب صورت امتزاج پیدا کیا تھا۔ اس دن سب عورتوں نے کمبی نیشن کر رکھا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ ان میں کسی کا بلاؤز خاکستری تھا تو ساری کالے رنگ کی تھی جس میں ستھرے کی ایک آدھ تار جھلملا رہی تھی۔

کئی موسم بدلے۔ خزاں گئی تو بہار آئی ـــ یعنی جس قسم کی خزاں اور بہار بمبئی میں آ سکتی ہیں اور پھر اس بہار میں ایک کاہش سی پیدا ہونی شروع ہو گئی ایک چبھن، تلخی کی ایک رمق چلی آئی جو محبت اور کامرانی کو حد درجہ گداز کر دیتی

ہے اور جذبوں کی آنکھوں میں آنسو چلے آتے ہیں۔ پھر کہیں ہرا زیادہ ہرا ہوگیا
اور اس پر تازگی اور شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جیسے بارش کے دو چھینٹوں کے
بیچ سبک سی ہوا پانی پر دوشالہ بن دیتی ہے۔ پھر سمندر میں اس قدر زہر دگھلا کہ
نیلم ہوگیا اور اس میں مچھلیوں کی چاندیاں چمکنے لگیں۔ آخر وہ چاندیاں تڑپ تڑپ
اپنے آپ کو ماہی گیروں کے حوالے کرنے لگیں۔ پھر آسمان پر صوت و تجلی کا ٹکراؤ
بادل گرجے، بجلی تڑپی اور یکایک چھاجوں پانی پڑنے لگا۔ اس عرصہ میں جوگیا
نے کئی نیلے پیلے، اودے، کالے، سردئی اور سرمئی، دھانی اور چمپئی رنگ بدلے
اسے کتنی جلدی تھی لڑکی سے عورت بن جانے کی اور پھر عورت سے ماں ہوجانے
کی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی صحت مند لڑکی کے جب بچے پیدا ہوں گے، جڑواں
ہوں گے بلکہ تین چار بھی ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں کیسے سنبھالوں گا؟ اور اس
خیال کے آتے ہی میں ہنسنے لگا۔

ان دنوں جوگیا اپنی بیمار ماں کے پیر پکڑ کر اس سے لپ اسٹک لگانے
کی اجازت بھی لے چکی تھی۔ ایک طرف زندگی دھیرے دھیرے بجھی جا رہی
اور دوسری طرف لپک لپک کر کھل رہی تھی۔ جوگیا نے لپ اسٹک استعمال کرنے
کی اجازت لے لی تھی لیکن اتنی ساریوں، اتنے رنگوں کے لئے اتنے لپ اسٹک
کہاں سے لاتی؟ میں نے ایک دن میکس فیکٹر کی لپ اسٹک خرید کر تحفے میں
جوگیا کو دی تو وہ کتنی خوش ہوئی۔ جیسے میں نے کسی بہت بڑے راز کی کلید
کے ہاتھ میں دیدی ہو۔ وہ بھول ہی گئی کہ وہ میرے ساتھ گرگام کے ٹرام
بیٹھے پر کھڑی ہے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد اس کی آنکھیں
اندر دھنس گئیں اور نمی سے باہر چھلکنے لگی۔ میں سمجھ گیا جوگیا بے حد جذباتی
ہے۔ بھلا میرے سامنے اتنی ممنون دکھائی دینے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن

دوسری تھی جس رنگ کی میں لپ اسٹک لایا تھا، اس سے میچ کرتی ہوئی ساری جوگیا کے پاس نہ تھی اور نہ خریدنے کے لئے پیسے تھے۔ میرے پاس بھی اتنے پیسے نہ تھے جن سے کوئی خوبصورت سی ساری خرید کر اسے دے سکتا۔ میں نے تو لپ اسٹک کے پیسے بھی موٹے بھیا کی جیب سے چرائے تھے اور یا بھابی کے ساتھ اس عشق میں بٹورے تھے جس کا حق صرف دیور ہی کو پہنچتا ہے۔

برسات ختم ہوئی تو ایک تماشا ہوا۔ جوگیا نے گھر میں بڑوں کے وقت کے پڑے ہوئے کچھ عقیق بیچ ڈالے اور میری لپ اسٹک کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ایک ساری خرید لی۔ اس بات کا مجھے کہاں پتہ چلتا لیکن ہمارے گھر میں ایک مخبر تھی، جوگیا کی سہیلی ہیما!...... جوگیا نے نارنجی سرخ رنگ کی ساری پہنی اور جب ہم اگیاری پارہ، لاقا نونیت کے جنگل میں ملے تو میں نے جوگیا کو چھیڑا۔ "جانتی ہو جوگیا! آج تم کیا لگتی ہو"؟

"کیا لگتی ہوں"؟

"بیر بہوٹی ..... جو برسات ہوتے ہی نکل آتی ہے"!

جوگیا کے دل میں کوئی شرارت آئی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "جانتے ہو تم کون ہو"؟

"ہے"

"بیر ـــ اور میں بیر بہوٹی"

اور اس کے بعد جوگیا اس قدر لال ہو کر بھاگ گئی کہ اس کے چہرے کے رنگ اور ساری کے رنگ میں ذرا بھی فرق نہ رہا۔

اس دن سب عورتوں نے نارنجی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اپنی آنکھوں کے اس جلوس کی تاب نہ لا کر میں نے پھر ہیمنت سے کہہ دیا کہ

ہیمنت نے اکیلے نہیں تین چار لڑکوں کو ساتھ لیا اور شاہراہ عام پر میری
بے عزتی کی۔ شاید مجھے اتنا بے عزتی کا احساس نہ ہوتا اگر سوکیشی وہاں نہ آجاتی
جو سفید نائیلون کی ساری پہنے ہوئے تھی اور اس میں تقریباً ننگی نظر آ رہی تھی
—— وہ روز بروز سچ مچ کا ماڈل ہوتی جا رہی تھی۔

جوگیا کی بیر بہوٹی بننے کی کتنی خواہش تھی، اس کا مجھے روح کی گہرائیوں
تک سے اندازہ تھا لیکن میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں اسکول
سے پاس ہو کر نکل جاؤں اور کوئی اچھی سی نوکری کر لوں اور یا تصویریں
بنا کر مالابار ہل اور وارڈن روڈ کے جھوٹے دقیقہ شناسوں کو ادنے پونے
میں بیچ دوں۔ لیکن ان سب باتوں کے لئے وقت چاہئے تھا جو میرے پاس
تو بہت تھا، تھوڑا بہت جوگیا کے پاس بھی تھا لیکن اس کی ماں کے پاس
نہ تھا۔ محنت اور مشقت کی وجہ سے جیسے کوئی کرم روگ لگ گیا تھا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ ایک دن بھابی اور موٹے بھیا سے کہہ دوں
لیکن مجھے اس کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ہیما، باپو گھر میں جوگیا کے پیار
دلار لیتی ہوئی ایکا ایکی اپنے گھر میں آ دھمکتی اور دھڑ سے کہہ ڈالتی۔

"کاکا! کیوں نہیں تم جوگیا سے بیاہ کر ڈالتے۔"

اور میں ہمیشہ کہتا —— "دھت!"

یہ "دھت" اگر میں ہی کہتا رہتا تو کوئی بات نہ تھی۔ کچھ دنوں بعد
ہیما کی اس ٹائیں ٹائیں پر بھیا اور بھابی نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا اور
ایک دن تو بھابی نے اس معصوم کو ایسا طمانچہ مارا کہ وہ الٹ کر دہلیز پر
جا رہی۔ اس دن میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس بارے میں
دونوں گھروں کے بیچ میں کوئی بات ہوئی ہے۔

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ جوگیا اور بجور کی ماں اور پنجابن نے مل کر بھابی کے ساتھ بات چلائی اور منہ کی کھائی۔ باپو گھر کی عورتیں یوں ٹھیک تھیں ان سے باتیں کر لینا، ان کے ساتھ چیزوں کا تبادلہ بھی درست تھا، ایک آدھ کو اشارے سے سلام کرنا اور چوری چھپے ان سے ہم بستری کر لینا بھی ٹھیک تھا لیکن ان کے ساتھ رشتے ناطے کی بات چلانا کسی طرح بھی درست نہیں تھا۔ پھر اور بھی بہت سی باتیں نکل آئیں جو ہمارے گجراتی گھروں کا وبال ان کا زہر، مٹی کا تیل اور کنواں ہوتی ہیں ـــــ جوگیا کی ماں لڑکی کو کچھ لمبا جوڑا دے دلا نہ سکتی تھی، اسی لئے ہمارے گھر میں جب کوئی لڑکی جوان ہوتی تو کچھ لوگ اس کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں ـــــ تیار ہو گئی مرنے کو۔ ـــ خیر دینے دلانے کی بات پر میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد بھابی اور گیان بھون کی عورتوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں ـــــ جوگیا کا باپ کون تھا؟ کوئی کہتی وہ مسلمان تھا اور کوئی بڑھیا گواہی دیتی وہ ایک پرتگالی تھا جو بروڈے میں بڑے عرصے تک رہا تھا۔ جو بھی ہو وہ سب باتیں تھیں۔ ایک بات جو تحقیق کے ساتھ مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جوگیا کی ماں منا ؤدر کے برہمن دیوان کی دوسری بیوی تھی جسے قانون نے نہیں مانا۔ جوگیا اس دیوان کی لڑکی تھی مگر لوگ جوگیا کی ماں، ایک بیاہتا عورت کو دیوان صاحب کی رکھیل کہتے تھے۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے جنہوں نے جوگیا کی ماں کے کچھ بھی پلے نہ پڑنے دیا اور وہ بمبئی چلی آئی۔ کچھ بھی تھا، اس میں جوگیا کا کیا قصور تھا؟ وہ تو اپنے باپ کی موت کے تین مہینے بعد پیدا ہوئی تھی اور باپ کی شفقت کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔ میں ان سب چیزوں کے خلاف جہاد کرنے اور جوگیا کے ساتھ فٹ پاتھ پر رہنے کو تیار

تھا لیکن باقی سب نے مل کر جوگیا کی ماں کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔ اب وہ چاہتی تھی جلدی جلدی سے جوگیا کا ہاتھ کسی واجبی گنداہے والے مرد کے ہاتھ میں دیدے۔ میرے گھر والوں کی باتوں کے کارن سے وہ میری صورت سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی سے صاف کہدیا تھا کہ اگر اس نے مجھ سے شادی کی بات بھی کی تو وہ کیرٹروں میں تیل چھڑک کر جل مرے گی۔ جوگیا اب کالج نہ جاتی تھی اور ہمارے گھر کے جوگیا والے فلیٹ کے کواڑ اکثر بند رہتے اور ہم تازہ ہوا کے ایک جھونکے کے لئے ترس گئے تھے۔

ایک شام مجھ پر بہت کھڑی آئی۔ سر شام ہی سے اندھیرے کے چمگادڑ کے بڑے بڑے پر مجھ غریب پر سمٹنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد یوں لگا جیسے کوئی میری شہ رگ پر اپنا منہ رکھے تیزی سے میری سانس چوس رہا ہے۔ جتنا میں اسے اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی اس کے دانت میرے گلے میں گڑے جا رہے ہیں۔ ان شاموں کا رنگ سیاہ بھی نہیں ہوتا اور سفید بھی نہیں ہوتا، ان کا صرف ایک ہی رنگ ہوتا ہے، حبس اور جانکاہی کا رنگ اور جن لوگوں پر ایسی شامیں آئی ہیں وہی جانتے ہیں کہ ایسے میں صرف ماں کی چھاتیاں اور محبوبہ کی چھاتیاں ہی ان کو بچا سکتی ہیں۔ میری ماں مر چکی تھی اور جوگیا میری نہ ہو سکتی تھی۔

افوہ ــــ! اتنی گھٹن، اتنی اداسی ــــ اداسی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے، میلا میلا، چھدرا چھدرا، جیسے منہ میں ریت کے بے شمار ذرے اور پھر اس میں ایک عفونت ہوتی ہے جس سے متلی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ آخر آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے احساس کی حدیں ختم ہو جا

میلا اور رنگوں کی پہچان جاتی رہتی ہے۔

صبح اٹھا تو میرا اس گھر، اس شہر، اس دنیا سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ اگر جوگیا کی ماں نہ ہوتی اور وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتی تو میں اسے لیکر کہیں بھی نکل جاتا۔ ۔۔ ۔۔ جبھی مجھے بیراگی یاد آنے لگے، بدھ بھکشو یاد آنے لگے جو اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہیں سے بھی بھکشا لیکر اپنے پیٹ میں ڈال لیتے اور پھر بیٹھ کر "اوم منے پدمنے" کا وردو کرنے لگتے ہیں۔

میں واقعی اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن سامنے پانچو گھر میں جوگیا کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور جوگیا مجھے سامنے نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راتوں نہیں سوئی۔ اس کے بال بے حد روکھے تھے اور یونہی ادھر ادھر چہرے اور گلے میں پڑے تھے۔ اس نے کنگھی اٹھائی اور بالوں میں کھبودی۔ کچھ دیر بعد وہ الماری کے پاس جا پہنچی۔ ۔۔ ۔۔

میں اسکول کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں سب عورتوں نے جوگیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ انہیں کس نے بتایا تھا؟ ۔۔ ۔۔ وہ اداس تھیں جیسے زندگی کی ماہیت جان لینے پر انہیں کوئی بیراگ ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھڑتالیں تھی اور منہ میں بھجن تھے جو نہ کسی کو دکھائی دے رہے تھے اور نہ سنائی دے رہے تھے۔ وہ بھکشونی ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہی تھیں اور انہیں کھٹکھٹا رہی تھیں۔ اس بھرے شہر بمبئی میں کوئی انہیں بھکشا دینے کے لئے باہر نہ آرہا تھا۔

اسکول پہنچا تو ہیمنت بدستور ہنس رہا تھا۔ آج اس نے پہل کی۔ بولا۔

"شہر کی عورتوں نے آج کیا رنگ پہن رکھا ہے"؟

میں اس بے حس آدمی کو جواب نہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے آپ ہی

میرے منہ سے نکل گیا — "آج سب جوگنیں بن گئی ہیں، سب نے بیراگ لے لیا ہے اور جوگیا پہن لیا ہے"

اس دن میں اسے اور سوکیشی کو گل مہر کے نیچے سے پام کے پیڑوں میں سے گھسیٹتا ہوا باڑ کے پاس لے گیا۔ سامنے سڑک چل رہی تھی اور اس پر انسان کے پتلے ساکت تھے۔ ان سب نے بیراگ پا لیا تھا اور جوگیا کھتیاں پہنے بلاارادہ بے مقصد پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہے تھے جیسے اس دنیا میں کوئی مرد نہیں کوئی عورت نہیں جسے ان کو جواب دینا ہے۔

میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جوگیا کپڑے پہنے ہاتھ میں کمنڈل لئے جا رہی تھی۔ ہیمنت کھکھلا کے ہنسا، ساتھ سوکیشی بھی ہنسی جس نے جینز پہن رکھی تھی اور اس کے کولھے، اس کی رانیں تک دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ پورے طور پر ماڈل بن چکی تھی۔

جب ہیمنت کی ہنسی تھمی تو اس نے کہا، "تو بالکل پاگل ہو گیا ہے، جگل۔۔ ۔ کہاں ہیں جوگیا کپڑے ؟ اس عورت نے تو ایک اودی ساری پہن رکھی ہے اور وہ کمنڈل جو تجھے دکھائی دیتا ہے ایک خوبصورت پرس ہے۔" سوکیشی نے بھی ہیمنت کی تائید کی۔

میں حواس باختہ سڑک پر کھڑا سامنے دیکھتا رہا۔ جبھی ایک بس رکی اور اس میں سے ایک لڑکی اتری۔ ۔ ۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے" ؟ میں نے اپنے آپ کہا — "وہ جوگن ہے، جوگیا کپڑے پہنے ہوئے میں کیا اندھا ہوں ؟"

لیکن اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لئے میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے یقین ہو گیا اور پیچھے دیکھتے ہوئے میں نے آواز دی۔ ہیمنٹ۔۔! لیکن ہیمنت اور سوکیشی ایک دوسرے کی باہنہ میں باہنہ ڈالے اندر جا چکے

تھے۔ ان کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ وہ مجھے ایسے ہی بے یار و مددگار اس صحرا کے کنارے چھوڑ گئے تھے جیسے کسی پاگل آدمی کو چھوڑ جاتے ہیں۔۔ ۔۔ یہ بھی ان کی عنایت تھی کہ انہوں نے مجھے پتھر نہیں مارے تھے۔

اور وہ لڑکی اس طرف آ رہی تھی۔ اب تو مجھے پورے سنسار پر پھیلے ہوئے اس رنگ کے بارے میں کسی قسم کا شک نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں یقین اور ایمان کی بلند آواز کے ساتھ ہیمنت اور سوکیشی کو پکارتا، وہ لڑکی میرے قریب آ چکی تھی

میں نے ایک آواز سنی ——"بیر"۔

اور میں نے چونک کر دیکھا۔ کسی دوسرے رنگ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ خود جوگیا تھی جسے میں نے اس صبح اپنے گیان بھون سے بانیو گھر کے کھلے دروازے میں سے، سب ساریوں میں سے جوگیا رنگ کی ساری کا انتخاب کرتے دیکھا تھا۔ ایک عجیب بے اختیاری کے عالم میں میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور عجیب تر بے بسی کے عالم میں رک گیا۔ جوگیا بولی "میں کل بڑودے جا رہی ہوں"۔

"کیوں جوگیا، بڑودے میں کیا ہے"؟

"میری ننھیال —— وہاں میرا بیاہ ہو رہا ہے، پرسوں۔۔ ۔۔"

"او۔۔ ۔۔"

"میں تم سے ملنے آئی تھی"۔

"تو ملو ——" میں جانے کیا کہہ رہا تھا۔۔ ۔۔

اس وقت آرٹس اسکول کے کچھ لڑکے لڑکیاں، پرنسپل صاحب اور کچھ دوسرے لوگ آ جا رہے تھے جبکہ جوگیا نے اچک کر اتنے زور سے میرا منہ چوم لیا کہ میں بوکھلا کر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ وہ اٹھارہ انیس برس کی لڑکی کی بجائے پینتیس چالیس برس کی ایک بھرپور عورت بن گئی تھی۔ اس کا بوسہ کتنا مرتعش تھا، کتنی مقدس وحشت اور شہوت تھی اس میں۔

اگر کچھ لوگ دیکھ بھی رہے تھے تو ہمیں وہ دکھائی نہ دیئے۔
"وہ دیکھ بھی رہے تھے تو کیا کر سکتے تھے" جاتے ہوئے جوگیا نے کہا۔
"میرے جانے کے بعد تم روئے تو میں تمہیں ماروں گی، ہاں" اور ساتھ ہی اس نے مجھے مکا دکھایا۔۔۔ اور اس کے بعد جوگیا چلی گئی۔

سویرے گیان بھون اور بانپو گھر کے سامنے ایک وکٹوریہ کھڑی تھی جس پر بانسار کا بوجھا اٹھانے والے کچھ سوٹ کیس اور کچھ ٹرنک رکھ رہے تھے اور کچھ یوں ہی ادھر ادھر کا سامان۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لئے بانپو گھر کے سب لوگ نیچے چلے آئے تھے لیکن سامنے گیان بھون سے میرے سوا کوئی نہ آیا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی تو کیا آتے معصوم ہیما کو بھی انہوں نے غسل خانے میں بند کر دیا تھا جہاں سے اس کے رونے کی آواز گلی میں آ رہی تھی۔

بجور کی ماں اور بخیابن کے سہارے جوگیا کی ماں اتری اور گرتی پڑتی وکٹوریہ میں بیٹھ گئی۔ تھوڑا سانس درست کیا اور سب کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی ۔۔۔ "اچھا بہنو! ہم چلتے بھلے، تم بستے بھلے"
اور پھر آئی ۔۔۔ جوگیا!

جوگیا نے ہلکے گلابی رنگ کی ایک خوبصورت ساری پہن رکھی تھی اور گلاب ہی کا پھول محنت اور خوبصورتی سے بنائے ہوئے جوڑے میں ٹانک رکھا تھا۔ ابھی وہ وکٹوریہ میں بیٹھی بھی نہ تھی کہ اگیاری کا پارسی پروہت ادھر آنکلا میں نے عادتاً کہا "صاحب جی"
"صاحب جی" پارسی پروہت نے کہا اور پھر مجھے اور جوگیا کو تقریباً ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر مسکرایا۔ آشیرواد میں ہاتھ اٹھائے اور منہ میں ژند اوستا کا جاپ کرتا ہوا چلا گیا۔ جوگیا گاڑی میں بیٹھی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔
جب، میں نے بھی مسکرا دیا!

●

یوکلپٹس

بہت ہی حرام اسا دن تھا جب کہ نومبر کی وہ ٹھٹھری ہوئی رات پیدا ہو رہی تھی۔ ملبے دھڑا دھڑ ایک دوسرے پر ڈھیر ہو رہے تھے اور مٹی کا وہ ٹیلہ بن رہے تھے جس میں سے یوکلپٹس کا پیڑ پھوٹ کر نکلنا تھا۔

کندن ایک اعصاب زدہ ٹیلیفون کے جواب میں گھر لوٹی تھی ایک ہاتھ سے اس نے سائیکل کا ہینڈل تھام رکھا تھا اور دوسرے سے کتابیں جو خام چمڑے کے فیتے میں کیریر پر ڈھیلی ہو رہی تھیں۔ یہ کتابیں کندن نے اسی شام فادر ولیم اسکول کی لائبریری سے نکلوائی تھیں، جہاں وہ وائس پرنسپل تھی۔ قاعدے سے کندن کو گولی کی طرح سے بنگلے میں داخل ہونا چاہئے تھا مگر پھاٹک کے آتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح سے پیڑ کے پاس رک گئی۔

—— شرجو یوکلپٹس کے پیڑ کا نام تھا۔

یہ پیڑ کندن نے تین سوا تین برس پہلے لگایا تھا جب کہ وہ نئی نئی دس کوس یونیورسٹی سے ٹیچنگ کا ڈپلوما کر کے آئی تھی۔ جب یہاں کیتھولک

چیلن فادر فشر رہا کرتا تھا جس نے بنگلے کا آدھا حصہ کماری کندن کو دے رکھا تھا۔ پھر برس ایک کے بعد وہ مشن کا کام پورا کرکے امریکہ چلا گیا اور کندن نے تنہائی سے گھبرا کر اپنی بوڑھی ماں کو بلا لیا۔ سائیکل کو جنگلے کے سہارے رکھ کر کندن سرجو کے پاس آئی اور اوپر کی طرف دیکھنے لگی۔ جہاں پتے اب تک اندھیرے کا رنگ لے چکے تھے۔ البتہ نیچے کی سفید ملائم اور برجی چھال ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پیار سے اس پر ہاتھ پھیرنے ہی والی تھی کہ ایک طرف برآمدے میں اسے اپنی جیلی فش ماں کا ہیولا سا نظر آیا۔ اسی دم جھک کر کندن نے پیڑ کے نیچے سے تازہ گرے ہوئے پتے اٹھائے اور ہاتھ میں مسل کر انہیں سونگھنے اور لانبے لانبے سانس لینے لگی جیسے اسے زکام ہوا ہو اور یوکلپٹس کی بو تنفس اور اس کے رگوں ریشوں کو ایک طرح کا سکون دے رہی ہو۔ پھر ماں کی طرف منہ کرتے ہوئے کندن تھوڑا کھسیائی ــــ "میں تو سرجو کو بڑھتے دیکھ بھی سکتی ہوں ماں" ــــ اور اس نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

ماں کے چہرے میں سے پسینے کے باریک قطرے رس رہے تھے جیسے کورے گھڑے میں پانی ڈالنے سے وہ رسنے لگتا ہے۔ ڈوپٹے سے ماں اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولی: "پودے دن کو نہیں رات کو بڑھتے ہیں کندنا۔"

"کیوں ــــ رات کو کیوں؟"

"اُپتی کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں۔"

اور پھر ماں چپ ہو گئی۔ کندن کو ماں سے کسی اور بات کی توقع بھی نہ تھی۔ وہ جانتی تھی ماں ایک پیڑ کے ساتھ اپنی بیٹی کی بیماری سی محبت کو دیکھ کر اکثر پریشان ہو اٹھتی ہے۔ سائیکل کو جنگلے پر سے اٹھا کر کندن برآمدے

کے پاس پہنچی ہی تھی کہ ماں نے کہنا شروع کیا " پھر کیا نادہی خلجگن لکھی نے "
— لکھی کندن کی کرشچن نوکرانی تھی۔ کندن نے وہیں رکتے ہوئے کہا
" کیا مطلب " ؟ اور پھر جیسے اپنے آپ ہی سمجھ گئی ۔۔ " شروع ہوگیا " ؟

" ہاں "

" کب " ؟

" جب پڑوس کے مالی سے تمہیں ٹالی فون کرایا تھا "

اور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ماں نیچے فرش ہی پر بیٹھ گئی۔ حالانکہ پاس ہی برآمدے میں ملاقاتیوں کے لئے رکھی ہوئی آدھی درجن بید کی کرسیاں پڑی تھیں — یہ حرکت عورتیں اس وقت کرتی ہیں جب کوئی مرنے والا ہو یا مر چکا ہو۔

ادھر لکھی اپنے کوارٹر میں کراہ رہی تھی، ادھر ماں گالیاں بکے جا رہی تھی۔ اس کی آخری گالی تھی " چھنار ۔۔ " جبھی لکھی کی چیخ سنائی دی تو ماں اور کندن دونوں منہ اٹھا کر اندھیرے میں دیکھنے لگیں، جیسے لکھی انہیں سامنے تڑپتی ہوئی نظر آ رہی ہو۔ شاید زچہ کے درد میں مبتلا عورت کہیں بھی ہو، دوسری سب عورتوں کو دکھائی دینے لگتی ہے۔

کندن نے ایک دم گھبرا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " ماں "

" سن رہی ہوں " ماں نے اپنے بوڑھے چرخ چوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے اٹھتے ہوئے کہا اور گرتے گرتے بچی " مجھے بھی کان دیئے ہیں پرماتما نے " وہ بولی — اور سچ مچ ہی اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے دونوں ہاتھ کانوں کی طرف اٹھا دیئے۔

کیا جذبہ تھا کہ دوسری چیخ کے ساتھ ہی ماں چلا اٹھی " مرتی ہے تو

مر جائے۔۔۔۔ کیوں نہیں دن کے وقت بناتی رانڈ؟۔۔۔۔۔ پارسال بھی ایسے ہی کیا تھا۔۔۔۔" ماں بولے بغیر بھی نہ رہ سکتی تھی "کیسے خوخون ہو گئے تھے میرے ہاتھ پیر اور کپڑے جو نوچندی میں بنوائے تھے۔ تم نے پیسے بھیجے تھے۔۔۔ میں اس کے باپ کی دائی ہوں"۔ پھر ماں کے پیر کوارٹر کی طرف اٹھ گئے، پھر وہ لوٹ بھی آئے۔

یہ چیخ جو تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دے رہی تھی مسلسل ہو گئی کندن کے پیٹ میں بھی جیسے کوئی آزار پیدا ہو گیا اور طنابیں سی نیچے کھنچنے لگیں۔ سامنے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولی "تو سمجھتی کیوں نہیں ماں؟ — وہ غریب ہے، پیسے والے سودا رد کر سکتے ہیں۔۔۔۔"

اور کندن آپ ہی کوارٹر کی طرف چلی۔ ماں نے لپک کر اسے بازو سے تھام لیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولی — "کندنا"! اور پھر کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگی "یہ کام تیرے ایسی کچی کنواری کا ہے؟"

ماں بکھی کے پاس جانا بھی چاہتی تھی اور اہمیت کو جتنا نا بھی۔ جاتے ہوئے وہ منہ میں کچھ بکے جا رہی تھی۔ صرف ایک ہی لفظ کندن کے کان میں پڑا — "چھنالہ"

کہیں سے کوئی چمگادڑ مارا اور ڈرائنگ روم کے اندر بیرا بولائی شکلیں پیدا کرتا ہوا سامنے پہاڑیوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے باہر اڑ گیا، جس میں سے ایک روز پہلے کی بارش کی وجہ سے بھبنٹ قطار در قطار اندر آ رہے تھے، اور سوداٹ کے بجلی کے ہنڈے سے ٹکرا کر زمین پر ڈھیر ہو رہے تھے۔ جب وہ

گرتے تو پتہ کبھی نہ چلتا، صرف نیچے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا جیسے زمین اوپر کی طرف اٹھ رہی ہو اور لمحوں کا ایک ٹیلہ بن رہا ہو۔ ۔۔ کندن کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی۔ روشنی میں تو اونچ نیچ سب نظر آتا ہے مگر اندھیرا ایک عجیب قسم کی یکسانیت پیدا کرتا ہے، صرف اس کے عادی ہو جانے پر مصیبتوں کے ہلکے خاکے اور گہرے خاکے دکھائی دیتے ہیں جو اس یکسانیت میں اور بھی تائید کا عالم پیدا کر دیتے ہیں۔ آدمی گھبرا کر کھڑکی چھوڑ دیتا ہے اور ایک بے پناہ حبس سے بچنے کے لئے کسی کا بھی گریبان پھاڑ دیتا ہے۔ ۔۔

کندن واپس آکر صوفے میں بیٹھی تو یوں معلوم ہوا جیسے صوفے کے بازو اوپر اٹھے اور ایک حسین لڑکی کو آغوش میں لے لیا۔۔ ۔۔ کندن انتظار کرنے لگی۔

پہلے تو انتظار ٹک ٹک کرتا رہا، پھر وہاں کے کیتھولک مشن کے گرجے میں لگے ہوئے گھڑیال کی طرح ٹن ٹن بجنے لگا۔ چیخیں تھم چکی تھیں۔ شاید ماں کے پہنچ جانے سے لکھی کو حوصلہ ہو گیا تھا، شاید بچہ پیدا ہو گیا تھا۔ ۔۔ ۔۔نہیں، بچہ اس دنیا میں آتا تو ضرور روتا۔۔ ۔۔

شاید ماں کو گرم پانی کی ضرورت پڑے۔۔ ۔۔ کندن لکھی کی کھولی تک جا پہنچی۔ لیکن سوائے ماں کے بڑبڑانے کے اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔ وہ ضرور گالیاں تھیں جنہوں نے اس سانحے کے پیش نظر ایک عجیب قسم کا سکوت اختیار کر لیا تھا۔ ۔۔ بیچ میں کندن کو کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی لکڑی کو چیرنے کے بجائے زمین پر مار مار کر توڑ رہا ہو۔ پھر لکھی کے ہونکنے کی آواز جیسے اس نے افیون کھائی ہو اور اصل کی تائید اور نقل کی تردید کر رہی ہو۔ کندن نے اپنے بدن میں سے کوئی بجلی جھٹکی اور بنگلے کی طرف مڑ آئی۔ راستے میں سر جُو کی

طرف دیکھا تو اسے ایک بچہ دکھائی دیا جس سے ڈر کر وہ بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی ۔۔ ۔۔

تھوڑے حواس بحال ہوئے تو کندن تپائی پر پڑی ہوئی کتابیں الٹنے پلٹنے لگی۔ ان پہ کھڑکی میں آنے والے بے شمار لمحے بکھرے پڑے تھے جن کے پر جھلسے ہوئے تھے اور بدن مردہ ۔ کندن نے اوپر کی کتاب کو صاف کیا جس کا عنوان تھا "مرد عورتوں کے بغیر۔۔ ۔۔" اس نے کتاب کھولی، پہلی چند سطریں پڑھیں اور پھر بند کرتے ہوئے سوچنے لگی ۔ "عورتیں مردوں کے بغیر۔۔ ۔۔"

فادر ولیم اسکول کی وائس پرنسپل کماری کندن ایم اے ٹی ڈپ کے بنگلے میں تین عورتیں تھیں اور تینوں مردوں کے بغیر ـــــ پہلی ماں ۔ سبھاشنی جواب چھیاسٹھ سال کی ہو چکی تھی اور بے شمار لمحے اس پر ڈھیر ہو کر تہیں جما چکے تھے ۔ اس کا نام آج کل کی لڑکیوں کا سا تھا ۔ لیکن اب تک اس نام کی سب لڑکیاں بوڑھی ہو چکی تھیں، نئے نام پرانے ہو چکے تھے اور نئی طرز کے وضع نہ ہوئے تھے اور لوگ مجبور ہو کر پرانے ناموں پر لوٹ آئے تھے ۔ جیسے ـــ کندن ۔۔ ۔۔ جو نام تو بوڑھا تھا مگر اب جوان ہو چکا تھا ۔ پچیس چھبیس برس کا ـــ خوبصورت اور دمکتا ہوا ـــ سبھاشنی بدھوا تھی اور کندن یتیم ۔ اس نے تو باپ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی اور زندگی بھر اس کے لئے تڑپتی رہی تھی ۔ ابھی وہ پیٹ ہی میں تھی کہ ماں کے بیان کے مطابق کندن کا باپ چل بسا تھا ۔ اس صدی کے شروع میں جو پلیگ پڑی تھی اس نے موت میں سچ اور جھوٹ کو برابر کر دیا تھا، عجیب سی یکسانیت پیدا کر دی تھی ۔ اسی لئے جب مشن میں فادر مائیکل آسمانی باپ کے باتیں کرتا تو کندن ہمیشہ سوچنے لگتی ـــ وہ تو مر چکا ہے، کسی زمینی پلیگ میں ۔ اور جب اسے کہا جاتا کہ آسمانی باپ لافانی ہے وہ کسی پلیگ میں

نہیں مرسکتا، تو وہ اسے ڈھونڈنے کے سلسلے میں قریب کے کسی بھی مرد پر عاشق ہو جاتی. چاہے وہ کیتھولک چیپلین ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کیتھولک پجاری کبھی شادی نہیں کر سکتے۔

کئی بار کندن نے چچا، تاؤ اور ددھیال کے بارے میں پوچھا لیکن ماں نے ہمیشہ دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ دیا۔" سب کھپ گئے دوسری پلیگ میں۔ ۔ ۔ تیسری پلیگ کب آنے والی تھی؟" پھر ایکا ایکی متجسّس سی نگاہیں کندن پر پھینکتی ہوئی ماں پوچھنے لگتی ۔" تو کیوں پوچھتی ہے؟"

"ایسے ہی" کندن جواب دیتی اور پھر کہہ اٹھتی "ماں! آج ٹیچر نے مجھے یہ ریشمی رومال دیا تھا، مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ ۔ ۔"

سبھاشنی نے اپنا رنڈاپا اپنے چچیرے بھائی امولک رام کے ہاں کاٹ دیا تھا جو امرت سر میں لاہور اور تبت سے آئے ہوئے کٹھ کا بیوپار کرتا تھا۔ کٹھ جو مرتے ہوئے آدمی میں بھی ایک بار تو زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ وہ مرتا ضرور ہے لیکن اس سے پہلے وصیت کر جاتا ہے۔ سبھاشنی نے کندن کے ساتھ ساتھ اپنی کھینچی ہوئی اور رنیچے کھلائے تھے اور اس کے خوش رو تی کے روکھے سوکھے ٹکڑے پائے تھے۔ اسی لئے کندن کے لئے اس کی لوریاں بیجن ہو گئی تھیں۔۔۔ رد کھا سو کھا رام کا ٹکڑا میٹھا کیا اور سلونا کیا۔ ۔ ۔ وہ بھابی کے پھٹے پرانے پہنتی تھی تو اکثر باہر نہ نکل سکتی تھی کیوں کہ اس کا جسم جوں کا توں بھرا ہوا تھا حالانکہ بھابی کا خرچ کی وجہ سے چاند کی طرح گھٹتا جا رہا تھا۔ بھابی کے کپڑوں میں سبھاشنی برہنہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک جسم کے احساس اور اذیت پسندی کے جذبے میں نیچے فرش پہ سوتی تھی اور ایک راہبانیت سی اس کے جذبات پہ چھائی رہتی تھی۔ جس میں اداسی بھری ایک تسلی تھی اسے

اس حدت کا احساس ہی نہ تھا جو مرد کے ساتھ چارپائی پہ سونے سے عورت
کے بدن میں اپنے آپ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پھر سوتے میں کبھی تکیہ اور لحاف
وغیرہ ہوتے تھے اور کبھی نہ ہوتے تھے۔ سوائے سردی کے موسم میں ان کی
ضرورت بھی کیا تھی ــــ پھر سبھاشنی سوتی ہی کہاں تھی؟ جاگتی بھی کہاں تھی۔
وہ تو خواب اور بیداری کے اعراف میں روتی ہنستی رہتی اور بھجن اس کا
سہارا ہوتے ــــ

جب نینن سے نیند گنوائی تکیہ لیٹ بچھونا کیا
آخر سمجھ بوجھ کچھ سوچ پیارے۔ پیار کیا تو رونا کیا

بھابی کی گالیوں کو سبھاشنی نے گھی کی نالیں سمجھا اور مار پیٹ، دھکوں
گھونسوں کی جھڑیاں، اور یوں کندن کو پڑھایا۔ باقی وہ وظیفوں اور
سرکاری گرانٹوں سے آگے بڑھتی بڑھتی امریکہ جا پہنچی۔ وہ خوبصورت تو
تھی ہی اس پر تعلیم نے اس کے حسن کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ آنکھیں بڑی
بڑی تھیں جن میں بیسیوں شک تھے اور وسوسے۔ ایک عجیب سے ارتقار
میں اس کی آنکھیں کانوں تک کھینچ آئی تھیں معلوم ہوتا تھا سامنے جاتی
ہے تو پیچھے بھی دکھائی دیتا ہوگا۔ یا وہ ایسے ہی دیکھتی رہتی تھی جیسے کوئی
اس کا پیچھا کر رہا ہو ــــ باپ نہ ہونے سے لڑکیوں کو کیسی کیسی باتوں
کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔۔۔۔ اس کے باوجود بارہ تیرہ برس ہی کی
عمر میں کندن کو ایک ایسے مرد کے سلسلے میں تجربہ ہوا تھا جس کے بارے
میں وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ شاید وہ مر جاتی مگر گنگھ نے اس کی زندگی بچالی
تاکہ بڑی ہو کر وہ یوکلپٹس کا پیڑ ہو سکے۔ یہ سب ایک طرح سے اچھا ہوا
ورنہ کندن پڑھائی ہی کو شادی نہ سمجھتی ــــ

تیسری عورت لکھی تھی، وہ تیس ایک برس کی تھی اور محنتی ہونے کی وجہ سے تندرست۔ اس کا اصلی نام لکشمی رام داس تھا اور اس کے شوہر کا نام سدھو، مگر کمیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس کا نام کچھ یوں چڑھا کہ پھر نہ ہٹا۔ لکھی آج تک نہ بتا سکتی تھی کہ رام داس اس کے باپ کا نام تھا یا کسی پہلے شوہر کا۔ کبھی وہ اسے شوہر کا نام بتاتی اور کبھی باپ کا اور پھر ایک ابتری کے عالم میں — "میرے باپ کا بھی وہ نام تھا جو میرے مرد کا"

لکھی کا یہ تیسرا مرد — سدھو وہاں سے اکاون یا باون میل دور کسی کلائری میں کام کرتا تھا۔ وہ سال میں صرف ایک دو بار آتا۔ جب اس کے کپڑے کوئلے اور اس کی دھول سے اٹے ہوتے اور چہرے پر سیاہیاں کھنڈی ہوتیں، کچھ تو کوئلے کی اور کچھ ایسے جرائم کی جن کا وہ بے اختیار مرتکب ہوتا۔ ان باتوں کے کارن وہ آپ ہی اپنا ہمزاد معلوم ہوتا تھا۔ وہ آتا تو نہایت بدصورت معلوم ہوتا اور جب نہ آتا تو اس سے بھی زیادہ بدصورت..

سدھو کا بھوت، بنگلے میں دکھائی پڑتے ہی ماں سبھاشنی اور بیٹی کندن پنجے جھاڑ کر لکھی کے پیچھے پڑ جاتیں —

"کیوں تو ہر بار اس کے ساتھ راس رچا بیٹھتی ہے؟"

— جب وہ تیری ذمہ داری لیتا ہے، نہ تیرے بچوں کی... "

"سب مرد ایک ہی رسی سے پھانسی دیئے جانے کے قابل ہیں۔"

مرد... لکھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔ کبھی سب غلط اور کبھی صحیح معلوم ہونے لگتا... ہاں، ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے سب مرد اسی قابل ہیں کہ... میں ایک اور کروں گی، مگر نہیں.. وہ بھی تو — پھر وہ غصے میں بھر جاتی اور اپنا ہاتھ جوتی کی طرف لے جاتی۔ اس کے

بعد سدھو کا ہمزاد اس کی طرف آتا، نم آنکھیں، ہاتھ جوڑے ہوئے اور لکھی کا ہاتھ جوتی کی طرف جانے لگتا۔ جب تک سدھو کا ہاتھ لکھی کے بدن پر جا پڑتا اور لکھی کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی۔ آنکھیں چڑھنے، بند ہونے لگتیں اور وہ بے دم سی ہو کر گر جاتی ــــــ اسے جبھی پتہ چلتا جب اس کے پیٹ میں کیڑا رینگنے لگتا ــــــ

کرشچین ہونے کے ناطے لکھی میں صبر تھا اور شکر بھی۔ لیکن کندن نہ کرشچین تھی نہ مسلمان اور نہ ہندو۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی جو سوچتی۔ کیا بکواس ہے یہ، بچہ ہمیشہ عورت کو اٹھانا پڑتا۔ ایک دن تو آئے گا جب چاند، زحل اور مشتری تک پہنچنے والے عورت کی سوچ بچار کے افلاک پر پہنچیں گے اور مرد کے ہاں بھی بچہ پیدا ہونے کا سامان کریں گے۔ آخر سلسلہ تقلیب ہی کا ہے نا۔ ... ... مگر ایسے میں داڑھی اگ آئے گی۔ ... ... اچھی لگتی ہے ... ...

ماں گرتی پڑتی چلی آئی ــــــ اس کے کالے بھورے بال بھیگے ہونے پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ منہ پہ، کچھ جھکے جھکے شانوں پر۔ اس نے کس قدر جلدی میں اپنے ہاتھ پیر خون سے صاف کئے تھے۔ اس پہ بھی بانات کی قمیض پر ایک چھیچھڑا لگا ہوا تھا جس کے بارے میں وہ نہ جانتی تھی۔ وہ گالیاں دے رہی تھی، تیز تیز اور بے ربط۔ اس کی آخری گالی تھی ــــــ "ایک لڑکی اور چلی آئی۔"

کندن چونک کر اٹھی۔ بچہ پیدا کر دینے کے بعد سنبھالنے کا کام کندن کا تھا۔ جب وہ لکھی کے کوارٹر کی طرف لپکی تو ماں کہہ رہی تھی ــــــ "ایک لائسن (لائسنس) لے لو، کندنا! ... ... اب کے وہ حرامی آیا تو میں

اسے گولی مار دوں گی۔"

ماں سبھاشنی اپنے تخیل میں لاش دیکھ رہی تھی اور رو بھی رہی تھی جیسے ہر عورت اپنے بیٹے کی سرزنش کے بعد رونے بیٹھ جاتی ہے۔۔۔۔۔

مرجو لہراتا رہا۔ ہر صبح و شام اسکول جانے سے پہلے اور لوٹنے کے بعد کندن اس کے پاس رکتی اور اس کی نرم سی چھال پر ہاتھ پھیرتی، پیار کرتی۔۔ ۔۔ اور ماں سبھاشنی دیکھتی، پکارتی رہتی ــــ کندنا! اب آبھی جا!"

مرجو اب بیس پچیس فٹ لمبا ہو گیا تھا۔ کہیں سولہ سترہ فٹ اوپر جا کر تو اس کے تنے پھوٹتے تھے اور پتے پھلیوں کی طرح عموماً لٹکے رہتے جس کے کارن دوپہر کے سمے جب سائے کی ضرورت ہوتی تو مرجو بیکار ثابت ہوتا۔ البتہ پہلے اور پچھلے پہر جب چھاؤں یوں ہی بدن میں کپکپی پیدا کرتی تب یہ بھی لانبے اور گھنیرے سائے پیدا کرنے لگتا اور لکھی کی تینوں، چاروں بیٹیاں ریل ریل کھیلتی ہوئی ایک دوسرے کا فراک تھامے، نیچے سے ننگی، پیڑ کے نیچے چلی آتیں۔ اس کی آخری بیٹی ریوڑی تھی ــــ اپنا گول مٹول اور چیچک دار چہرہ لئے اور پیڑ کے نیچے سے ریت کے ملبے اکٹھے کرنے لگتی۔

کندن نے ماں کے کہنے پہ بندوق کا لائسنس تو نہ لیا تھا البتہ ایک اور بندوبست کیا تھا جو بندوق سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ بندوق نورات کے وقت بیکار بھی ثابت ہو سکتی ہے لیکن وہ ہتھیار کبھی خالی نہ جاتا اس لئے چاکلیٹ کے رنگ کا ایک کتا رکھ لیا تھا جس کا منہ خوفناک تھا اور جبڑے کالے، جن میں سے ایک فٹ کی زبان ہمیشہ باہر لٹکتی رہتی تھی۔

چیگوار بہت مرڈی کتا تھا۔ سدھو کو بنگلے میں آنے دیتا تو کجا، کندن کو بھی اندر آنے کے لئے اس سے اجازت لینی پڑتی تھی۔

بچیوں سے جیگوار البتہ مانوس ہو چکا تھا کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے بنگلے میں رہتی تھیں۔

ایک دن لکھی کو ابکائیاں آنے لگیں اور بہت ادھر ادھر کی کرنے کے باوجود ماں کو پتہ چل گیا، اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ کیسے ہوا؟ لکھی اس کا تسلّی بخش جواب نہ دے سکتی تھی۔ اس نے بڑی بڑی قسمیں کھائیں کہ وہ اپنے مرد کے پاس نہیں گئی۔ ماں سبھاشنی اور کندن جانتی تھیں کہ ربوڑی کے بعد سدھو بنگلے میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ لکھی نے چوری چھپے کوئی اور مرد کر لیا ہو مگر لکھی انکار کرتی تھی۔ وہ یہ بات بھی "سچ" کہتی تھی کہ اس نے کسی مرد کا منہ نہیں دیکھا ۔۔۔ نہیں دیکھا تو پھر سب کیسے ہوا؟

بنگلے میں کہرام مچ گیا ۔۔۔ لکھی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی اور ماں بیٹی آپس میں لڑنے لگیں۔ ماں اس "کتیا" کو باہر پھنکوا دینا چاہتی تھی مگر کندن اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی ۔۔۔ اتنے ڈھیر سارے بچے لے کر وہ کہاں جائے؟ ماں نے خود اپنے بھائی امولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی۔ کندن نے بہت سمجھایا بجھایا، پیروں پڑی، لیکن جب ماں پاپ کی ہمسائی ہونے کو تیار نہ ہوئی تو کندن نے صاف کہہ دیا ۔۔۔ "اچھا ماں تم جاؤ تو جاؤ میں لکھی کو نہ نکالوں گی"۔ اس پر ماں خوب دھاڑیں مار کر روئی۔ یہ بیٹی میری ۔۔۔ ۔۔۔ ماں کا جانا سہ سکتی ہے لیکن لکھی کا نہیں۔ لکھی اس کی کیا ہوتی ہے؟ جبھی ماں کو بھائی کے غصے یاد آئے اور اس نے بیٹی کے پیروں پہ سر رکھ دیا اور سفید بالوں کا واسطہ دیکر معافی مانگ لی۔

لیکن پھر لکھی سے وہی پوچھ گچھ شروع ۔ "سچ بتا کہاں سے لائی ہے؟"
"کہیں سے نہیں۔" لکھی کہتی۔ "اگر میں نے گناہ کیا ہو تو خدا وند یسوع میری چاروں بیٹیوں کو لے جائیں۔"

"بیٹیوں کا کیا ہے" ، ماں کہتی۔ "وہ تو ہر عورت چاہتی ہے۔"

کندن ایک جھٹکے کے ساتھ بات کاٹ دیتی۔ "ماں۔"

ماں کندن کی طرف دیکھتی۔

"میں بھی تیری بیٹی ہوں۔" کندن آنکھوں میں شکایتیں، حکایتیں لئے ہوئے ماں سے کہتی۔ "تو چاہتی ہے پرماتما مجھے بھی لے جائیں۔"

ماں سبھاشنی کندن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تاکہ وہ اس سے زیادہ اشبھ اور ادگت والی بات نہ کہہ سکے اور پھر اپنی بیٹی سے لپٹ جاتی۔ کہتی ہوں "کندنی" ــــ اور پھر ــــ "تو میری بات نہیں سمجھتی۔ میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں میں بھی سوچتی ہوں کیوں اس سنسار میں چلی آئی ، کیوں نہ پیدا ہوتے ہی مر گئی۔"

اس بات کے مہینے ڈیڑھ کے بعد صبح کاذب کے قریب جگوار بہت غرایا! بہت بھونکا۔ لیکن وہ لوہے کی موٹی سی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ برآمدے کے جس ستون کے ساتھ اسے باندھا گیا تھا، اپنی جگہ سے ہل گیا تھا مگر زنجیر نہ ٹوٹی۔ اس کے یوں بے تحاشہ بھونکنے سے ماں اور کندن نے لیمپ ہاتھ میں لیکر ایک دو بار باہر جھانکا بھی مگر کچھ نہ دکھائی دینے پر خاموش ہو گئیں۔ صرف ماں نے کہا۔ "جنگار کو کیا ہوا، آج؟"

"جانے . . . بہت ہی بھونکا ہے۔"

"ادھر ہی بھونکتا ہے جس طرف سرجو ہے۔"

کندن نے ایک بار ادھر دیکھ لیا حالانکہ اندھی سی روشنی میں سرجو کی

چھال بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ کندن بولی۔" ہاں مامی! جانوروں کو وہ بھی سب دکھائی دیتا ہے جو ہم انسان نہیں دیکھ سکتے۔"

اور کندن نے پٹے سے گھسیٹتے ہوئے جیگوار کو اندر ڈرائنگ روم میں باندھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ہاں، اب سدھو آ بھی جاتا تو کیا بگڑتا ---؟

لیکن پو پھٹے جب منہ میں برش لئے، کاندھے پر تولیہ رکھے، نائٹ گون میں ملبوس کندن باتھ روم سے بغلی کمرے میں داخل ہونے لگی تو اسے اپنی نگاہوں کے سامنے یوکلپٹس کے نیچے کوئی سفید سی چیز دکھائی دی۔ وہ پہلے ٹھٹھکی اور پھر سنبھلتی ہوئی اس طرف بڑھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بیٹھا ہوا ہے اور دعا، پڑھ رہا ہے۔ جبھی ایک سفید فرغل پورے قد میں سامنے کھڑا ہو گیا۔ کسی آدمی کا چہرہ دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا ---

" کون ہے؟" کندن نے فرغل سے چند ہاتھ پر رکتے ہوئے پوچھا۔

فرغل نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف پچھم سے آنے والی ہوا سے وہ کھوٹا سا ہلا۔ کندن ایک قدم اور بڑھی اور اپنی نظروں کے کیمرے کا ڈایا فرام کھولتے ہوئے چلائی: " باب!"

پھر وہ برش، تولیہ وغیرہ پھینکتے ہوئے دونوں بازو پورے پھیلا کر باب کی طرف لپکی۔ باب ساکت وجامد کھڑا تھا --- کندن اس سے لپٹ گئی --- " باب ... باب ... "

باب کے ہاتھ فرغل میں تھے۔ وہ خاموش تھا۔ اس نے کہا بھی تو اتنا" keep away "

کندن بھونچکی رہ کر تھوڑا پیچھے ہٹ گئی اور نگاہوں میں شبے لئے بابی فسٹر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دن نکل رہا تھا۔ صبح مشرق کے

پر تو میں باب کی آنکھوں کے نمناک کونے دکھائی دے رہے تھے اور چہرہ پر گناہوں کے احساس جو بہت سی غیر فانی چیزوں کی طرح سے کبھی نہیں مرتے۔

کندن نے پوچھ ہی لیا: "امریکہ سے کب آئے؟"

"رات۔" بابی فنتر نے وہیں سے جواب دیا۔ "ایر انڈیا سے۔۔۔ پھر مائیکل کی کار میں۔۔۔" کندن ایکا ایکی بھڑک اٹھی۔ غصے اور رقت میں ڈوبی آواز سے بولی: "کیوں؟ کیوں آئے تم؟ کیا ضرورت تھی؟۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

بابی فنتر جوں کا توں کھڑا رہا۔

کندن نے ہانپتے ہوئے پیچھے کی طرف آواز دی: "جیگوار۔۔۔"

جیگوار کندن کے پکارنے سے پہلے ہی بھونک رہا تھا۔ اسے کوئی بو آ گئی تھی اور وہ زنجیر تڑا تڑا کر باہر آنے، اس اجنبی کو کچا چبانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ کندن اسے کھول کر فادر فنتر پر چھوڑ دینے کے لئے لپکی لیکن پھر لوٹ آئی اور سامنے دکھائی دینے والی برف کی سل پہ یورشیں شروع کر دیں۔ وہ سلیں توڑ رہی تھی اور چلا رہی تھی: "باب۔۔۔ باب بولو، کچھ تو بولو۔۔۔ اور کچھ نہیں تو گالی ہی دو، اس سے بڑی جو تم نے مجھے دی ہے۔"

کندن کا جسم ساتھ لگتے ہوئے فادر فنتر کی پاکیزگی کے ہمالے اور اس کے وطن کے راکیز پگھلنے پسیجنے لگے۔ چند لمحے پہلے سردی میں ٹھٹھرنے والے دو جسموں پہ کوئی لحاف سے چلے آئے جنہیں اتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے باب بولا: "تم عورتیں سمجھتی ہو مردوں کے عصمت ہی نہیں ہوتی؟"

کندن نے تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے بابی کی روح میں جھانکا اور کانپتی

ہوئی منت اور آہ وزاری پر اتر آئی۔
"میں نے عورت ہو کر تمہیں معاف کر دیا۔ باب ۔ ۔ ۔ اور تم ۔ ۔ ۔"
— "میرے اور تمہارے درمیان ۔ ۔ ۔ میں عورت ہوں"
— اور بابی اپنا ہاتھ چھڑا کر سینے پر کراس پیدا کرتا ہوا چل دیا
کندن پھاٹک تک اس کے پیچھے بھاگی، پکارتی ہوئی "باب ۔ ۔ ۔ باب"
اور جب باب نہ پلٹا تو کندن وہیں کھڑی ہو گئی اور اسے جاتے دیکھنے
لگی۔ پھر اسے خیال آیا — شاید ۔ ۔ ۔
اور اس نے ایک بار پھر بلند آواز میں پکارا "فا ۔ ۔ ۔ د ۔ ۔ ۔ ر"
اور اس کی آواز بے شمار گھاٹیوں اور ان کی سیاہ تہوں میں گرتی جذب
ہوتی ہوئی دکھائی دی۔
ماں نے باب فنشر کو نہ دیکھا تھا "بیٹیا تم کس سے باتیں کر رہی
تھیں؟" اس نے پوچھا۔ کندن نے اپنی آنکھوں سے مایوسیاں پونچھ
ڈالنے کی کوشش کی اور نیچے دیکھتے ہوئے بولی "اپنے آپ سے ۔ ۔ ۔"

لکھی پہ اب تک ان سوالوں کی بوچھار ہو رہی تھی "سچ بتا کون تھا؟
۔ ۔ ۔ کہاں سے لائی یہ اچنبے کی گانٹھ؟"
"تم تو یہ مت پوچھو ماں"
ماں ایکا ایکی ڈر گئی۔ اس نے بیٹی کے چہرے پہ دیکھا اور کچھ مطلب
ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کندن نے بالقصد چہرے پہ ایک معصومیت لاتے
ہوئے کہا "ہم عورتیں ہیں ۔ ۔ ۔ ہمیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، ماں!"

کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ بچہ ہے ۔۔۔؟"
"اگر پھر لڑکی ہو گئی تو؟"
"لڑکی کیا انسان نہیں ہوتی ؟"
"ہوتی ہے مگر ۔۔۔"

اور پھر سب باتیں ان سوالوں میں گم ہو گئیں جو عورت سے ازل سے پوچھے جا رہے ہیں اور ابد تک پوچھے جائیں گے جن کا وہ کبھی جواب دے گی اور نہ کبھی دے سکے گی۔ دے گی بھی تو اس پہ ہزاروں دباؤ ہوں گے ـــ سماجی، اخلاقی، اور بچے کو کچھ پتہ نہ ہو گا۔ ماں ڈری سہمی رہے گی ـــ

گرجے میں لکھی نے 'کنفیشن' کیا تو ایک اور صورت پیدا ہو گئی جس نے فادر مائیکل، فادر روبیلو، سسٹر سپیریا انجیلا کو بھگدڑ میں ڈال دیا۔ بابی فشر ابھی تک چپ اور دم سادھے ساری باتیں سن رہا تھا۔ لکھی نے کہا "وہ خواب میں آیا تھا"

اس پر معاملہ اور ابتر ہو گیا "کون؟" سسٹر انجیلا نے پوچھا۔

کندن بھی وہیں تھی اس نے لکھی کی مدد کرنے کی کوشش کی "سدھو؟" اس نے کہا، مگر لکھی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سب اور بھی حیران ہو کر جواب کے منتظر ہو گئے۔ لکھی نے اچٹتی ہوئی نظر سے سب کی طرف دیکھا۔ پھر آنکھیں جھپکتی ہوئی بولی "رام داس"

کمیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس ہی کا نام تھا۔۔۔

لکھی قسمیں لے رہی تھی جن پہ کوئی یقین کرے تو مرے، نہ کرے تو بھی مرے۔ عشا نے ربانی کی یہ شرکت ختم ہوئی۔ حیران و پریشان کندن نے

سسٹر انجیلا کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا: "خواب میں آیا تھا۔ .. کیا یہ ہو سکتا ہے سسٹر؟" سسٹر انجیلا نے خود بوکھلاہٹ کے عالم میں ایک مہمل سا جواب دیدیا۔

"کیوں نہیں؟ ... اگر سچ کہتی ہے، بھکشنی رام داس۔"

فرداً فرداً فادر روبیلو اور فادر مائیکل نے بھی کچھ ایسے ہی جواب دیئے۔ گرجے سے باہر سلیٹ سے بنے ہوئے راستے پہ کندن نے فادر فنٹر کو پکڑ لیا اور پوچھا: "کیا یہ ہو سکتا ہے .. ..؟"

فادر فنٹر نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کندن سے کہا: "نہیں۔"

کندن چونک گئی اور بولی: "فادر .. تم ایک کیتھولک پادری ہو کر اس بات کو نہیں مانتے۔"

"نہیں ــــ"

"کیوں نہیں ــــ؟"

"اس لئے کہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے میں فرق ہے .. .. میرا خیال ہے رات کے وقت سدھو چپکے سے چلا آیا ہوگا۔" کندن کو ماں کا فقرہ یاد آیا: "اُبنتی کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں ــــ" مگر فادر فنٹر کو آخر حد تک پہنچانے کے لئے کندن بولی

"سدھو یا رام داس؟"

"سدھو۔"

"رام داس کیوں نہیں؟"

"رام داس کوئی حقیقت نہیں رکھتا .. .. اس کا کوئی وجود نہیں۔ وہ تو صرف نام ہے رجسٹر میں ــــ"

"ہاں مگر"، کندن نے ضد کی۔ "آیا کبھی تو لکھی کو پتہ نہ چلا؟"
"تم تو جانتی ہو" فادر فنشر نے کندن کی نگاہوں کو ٹالتے ہوئے کہا "پھر خواب کتنا گہرا ہو جاتا ہے۔"
کندن جذبات سے معمور ہو گئی۔ "باب"۔ اس نے کہا۔ "اگر تم ان باتوں کو مانتے ہو تو کیوں نہیں یہ مشن چھوڑ دیتے؟ کیوں نہیں شادی ــــ"
باب فنشر نے کندن کو وہیں روک دیا صرف اتنا کہہ کر۔ "نہیں۔"
"تم کیوں نہیں سمجھنے کی کوشش کرتے، باب! اس دنیا کے سب دھندے کرتے ہوئے آدمی پادری سے بھی بڑا ہو جاتا ہے، یسوع ــ"
باب نے پھر ٹوک دیا ــ "تم نہیں سمجھ سکتیں۔"
اور فادر فنشر ایک ایک قدم سے دو دو سیڑھیاں پھاندتا ہوا واپس گرجے میں چلا گیا۔ پھر میری کے حضور میں دعائیں کرنے، رات کو اپنے مجرد بستر پہ سوتے اور روز آدھی رات کو اٹھ کر شیو بنانے اور پھر سو جانے.. .. ..
اس کے کچھ دیر بعد فادر فنشر ہمیشہ کے لئے لیڈلین وس کوسن چلا گیا۔

اب کے زچگی کے سلسلے میں لکھی کو بہت کڑی ہدایات تھیں۔ کندن نے ایک سستی مگر چیت چالاک سی دایا طے کر رکھی تھی۔ شہر پانچ میل دور تھا اور وہاں کے اسپتال کی بیڈ بعض وقت ارجنٹ کیس کے لئے بھی خالی نہ ہوتی تھیں۔ میٹرنٹی کا خرچ برداشت کرنے کی لکھی میں ہمت نہ تھی۔ کندن مدد کر سکتی تھی مگر ایک حد تک ــــ
لکھی زچگی کے سلسلے میں کوئی مصارف کرنے کو تیار ہی نہ تھی۔ ماں

سبھاشنی نے سیخ پا ہو کر کہا: "مر جائے گی کمبختی۔"

"ٹھیک ہے۔" لکھی نے گھڑا سا سر ہلا دیا: "چھٹی ہو جائے گی۔"

"ان چھوکریوں کو کون سنبھالے گا؟"

"خدا، جس نے پیدا کیا۔"

"انہیں پیدا کرنے میں تیرا کوئی ہاتھ نہیں؟"

"نہیں۔"

اور ناک تک بھری ہونے کے باوجود، شرارت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے لکھی مسکرا دی۔ اس کا مطلب تھا یہ وہی ہے جو وقت پر عقل پھرا دیتا ہے، کسی اپنے ہی کھیل کے لالچ میں۔

اور تو سب ٹھیک تھا لیکن چیتی دار چہرے والی ریوڑی ابھی بہت چھوٹی تھی اور کندن کو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر رحم آتا تھا۔ وہ اب تک ماں کو مکمل طور پر اپنا سمجھے ہوئے تھی۔ ماں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا اور ماں ہی اس کی روٹی ۔۔۔ اسے کیا معلوم چند ہی دن کے بعد لکھی اسے نہ پوچھے گی۔ اس لئے نہیں کہ وہ پوچھنا نہ چاہے گی بلکہ دوسرے بچے کے سلسلے میں الجھی ہونے کے کارن اسے فرصت ہی نہ ہو گی، اور اگر کہیں لڑکا پیدا ہو گیا تو؟ ... نہیں اس بنگلے کا قانون ٹوٹ جائے گا۔ لکھی جانتی تھی اور ماں سبھاشنی اور کندن بھی۔

دایا دن میں ایک دو چکر کاٹ جاتی تھی تاکہ لکھی کے چہرے پر تشکن بھی دکھائی دے تو ماں کو خبر کر دے۔ اس کے ساتھ طے ہوا تھا کہ وقت نبھا گئی تو لکھی کی تنخواہ سے دس روپے کاٹ کر اسے دیئے جائیں گے اور میم صاحب کندن بیس روپے اپنی جیب سے

دے گی۔ ساٹھ میں دھوتی، بلاؤز نیا فراک کا کپڑا۔ گیدرڈا سکرٹ۔

ایک دن دوپہر کے قریب دایا آئی تو لکھی ہنس ہنس کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ دایا کو خود بہت اچنبھا ہوا ۔۔۔ اس نے تو کوئی ایسی بات نہ کی تھی جس پہ کوئی ہنسے مگر ۔۔۔ اس کے تھوڑی دیر بعد لکھی پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ دایا اس کا منہ دیکھنے لگی اور ڈر گئی ۔۔۔ اس کے پڑوس میں ایسے ہی ایک کنڑی عورت بیٹھے بیٹھے پاگل ہو گئی تھی مگر وہ ہنسنے کے سوا اور کوئی بات نہ کر سکتی تھی۔ لیکن لکھی ۔۔۔ بات بھی کرتی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ لکھی کی ہنسی سے دایا مایوس ہو گئی اور سوچتی ہوئی چلی گئی۔ ابھی ہفتہ بھر کوئی خطرہ ہی نہیں۔

دایا کے جاتے ہی لکھی رونے لگی۔ وہ اتنا ہی روئی تڑپی جتنا وہ ہنستی تھی ۔۔۔ وہ ایک ایسے جی پن سے جو عورت ہی کا حصہ ہے، اپنے درد کو دباتی رہی۔ حتیٰ کہ شام کے سات بج گئے۔

کندن اسکول سے لوٹ کر ایک کتاب پڑھ رہی تھی، اور کھانے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں رسوئی کی طرف سے کوئی ضروری بات کہنے کے لئے آئی کہ ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔

"یہ ۔۔۔؟" ماں نے کہا۔

"لکھی کی آواز ۔۔۔" کندن بولی اور پھر دونوں اندھیرے میں لکھی کے گھر کی طرف دیکھنے لگیں۔ "ہائے مرب ناش!" ماں نے ماتھا اور چھاتی پیٹتے ہوئے کہا: "دایا تو کہہ کر گئی ہے ہفتے بھر کوئی خطرہ نہیں۔" اس کے بعد اور بھی ہو ہائے سنائی دینے لگیں۔ ماں سبھاشنی کی بے نقط گالیوں کا تانتا بندھنے لگا۔ بیچ میں جیگوار کے بے تحاشہ بھونکنے کی آواز بھی

شامل ہو گئی ۔

لیکن ماں سبھاشنی پھسکڑا مارے بیٹھی تھی اور اس بات کے انتظار میں تھی کب یہ آواز ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے، کندنا زندہ تو اس کتیا کو گھر سے نہ جانے دے گی، البتہ مردہ نہ رکھ سکے گی۔ اس نے کندن کو روک لیا۔ "اگر تو جائے تو میرا مرا منہ دیکھے"۔

کندن رک گئی۔ اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا اور چیخیں سنکر اس کے قدم دروازے کی طرف اٹھے اور ماں کے ڈر سے رک گئے۔ اس نے ملتجیانہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا جو پتھر بنی بیٹھی تھی۔ اندر سے وہ کیوں اور کس بات کے خوف سے کانپ رہی تھی اس کا کندن کو بھی اندازہ نہ تھا۔ شاید وہ بھی سل بنی بیٹھی رہتی لیکن ایکا ایکی کھلے دروازے میں ریوڑی چلی آئی — روتی ہوئی متوحش اور مادر زاد ننگی ۔۔ ۔۔

کندن سے رہا نہ گیا، وہ بولی "میں جاؤں گی ۔۔ ۔۔"

"کندنا" ماں نے آواز دی "میں کچھ کھا مروں گی"

اس پہ کندن نہ رکی اور کوارٹر کی طرف لپک گئی۔ ماں کو وہ دن یاد آیا جب اس نے اپنے بھائی امولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی تھی اور کندن اسے ہمیشہ کے لئے بھیج دینے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ آج اسے ماں کے مر جانے کی پروا بھی نہ تھی۔ یہ کیا رشتہ تھا، کندن کا اور لکھی کا؟ — سبھاشنی اٹھی اور اپنی "کچی کنواری" بیٹی کو اس کریہہ منظر سے بچانے کے لئے ریوڑی کو دھکا دیکر باہر نکل گئی۔

دو گھنٹے ماں بیٹی کشتی کرتی رہیں۔ کہیں نو ساڑھے نو بجے تولید ہوئی۔ حرامی بچہ پیدا ہو گیا۔۔۔ لیکن مرا ہوا۔۔۔ وہ لڑکا تھا۔۔۔۔

پیدائش کے فوراً بعد حیات دمامات سے بے خبر لکھی ایک تسکین کی میٹھی نیند سو گئی تھی۔ جس کا احساس اس جانکاہی کے بعد ہی ہوتا ہے۔ کنڈن کو یاد آیا۔۔۔ لکھی نے ایک بار کہا تھا "خداوندا! میں ایک لڑکا تو پیدا کر کے دیکھ لوں چاہے وہ مرا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔۔۔"

فادر مائیکل نے بچے کا فاتحہ پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کرسچین بنے بغیر مر گیا تھا۔ وہ زندگی میں شراب اور پانی کے ساتھ اس کا بپتسمہ نہ کر سکا تھا۔ لیکن اس کی اصل وجہ نہ فادر مائیکل نے بتائی نہ فادر روبیلو نے اور نہ مسٹر انجیلا نے۔۔۔۔

ماں نے بنگلے کے دوسرے کونے میں گڑھا کھودا۔ مردہ بچے کو دبانے کے لئے لکھی گھسٹتی ہوئی قبر تک چلی آئی۔ گھر سے شراب کی بوتلوں کا کھوکھا لئے۔ جسے بچے کا تابوت ہونا تھا۔ کھوکھے میں ڈالنے سے پہلے لکھی نے بچے کو دیکھا اور جھک کر اس کے لڑکے پن کو چوم لیا۔۔۔ اور پرے دیکھنے لگی۔ وہ رو بھی نہ رہی تھی۔

جب تابوت کو قبر میں رکھ کر اس پر مٹی ڈالی گئی تو وہ لمحوں کا ایک ڈھیر بن گیا۔ ایک ٹیلہ سا۔ لیکن کنڈن کہاں تھی۔ تھوڑی دیر میں کنڈن چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں سرو کا ایک پودا تھا جسے وہ جڑ دل سمیت کہیں سے کھود لائی تھی۔

"یہ اس پہ لگا دو، ماں۔۔۔"

ماں کے ہاتھ سے کھرپی گر گئی۔ اس نے ایک تیز نظر سے یوکلپٹس کے

پیڑ کی طرف دیکھا اور پھر بیٹی کی آنکھوں میں ـــــ اور پھر اپنے مٹی سے اٹے ہاتھوں کے ساتھ بیٹی سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

کچھ دیر کے بعد سب باتوں سے فارغ ہو کر ماں سبھاشنی نے کہا "بیٹا! اب تو شادی کر لے"۔

کندن نے ماں کی نظروں میں نظریں ڈالتے ہوئے کہا: "تم نے کیوں نہ کی، ماں"؟

"تم جو تھیں ـــــ میرا سب کچھ"۔

اور کندن نے اثبات میں سر ہلا دیا ـــــ

●

دیوالہ

روپ متی، میری نند جوان ہو چکی تھی۔ اس کی جوانی کی نشانی اس کا بدن ہی نہ تھا، اس کے لچھن بھی تھے —— وہ اس کا چونک، چونک کر بات کرنا، بے وجہ ہنسنا، بے وجہ اداس ہونا، شک کرنا اور پھر سب سے بڑی بات بیکار کی رازداری ۔۔۔

مجھے دنیا کبھی اچنبھے کی بات نہ معلوم ہوئی اور نہ ہی اس میں کوئی بڑا بھید دکھائی دیا۔ ہاں، بارہ ساڑھے بارہ کی تھی، جب میرا بیاہ ہو گیا اور میں مندروں کی اس بستی، دیول نگر چلی آئی ۔۔۔ یہ نیچے چونے گچ میں جو گول گول شیشے ٹنکے ہیں اور ساج کی لکڑی کا بڑا پھاٹک ہے، سب تبھی بنا تھا۔ ہاں لوہے کے یہ موٹے موٹے کیلے بعد میں گاڑے گئے تھے، اور دروازے پر گنیش جی کی مورتی، یہ بھی بعد ہی میں بنی تھی ——

میں یہیں ہوا محل کے اس چھجے میں بیٹھی تھی۔ ہونٹوں کا لاکھا لکھوٹا مجھے خود بُرا لگ رہا تھا۔ سسر، جیٹھ وغیرہ سبھی پیڑھی پر گئے تھے۔ دِدّا بھی مندر سے نہیں لوٹی تھیں۔ یہ بھی شہر میں نہ تھے۔ اتنا ہی پتہ تھا کہ

دیش بھر کی ارنڈی قبضے میں کرنے گئے ہیں۔ ایک بار اس پر قبضہ جم گیا تو اپنا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر جائے گا۔ اگرچہ بہت سوں کے دیوالے نکل جائیں گے۔

کھاتا پیتا گھر، یہاں سبھی فیشن کے طور پہ کام کرتے تھے۔ کھانے پکانے کے علاوہ اور کیا تھا — سویرا ہوتا تو ہم سوچتیں، کیا پکے گا؟ دوپہر کو تھوڑے کپڑے ادھر ادھر پھینکنے بعد، شام کیا پکے گا؟ کوئی پوچھے، گھوم پھر کر اہر اور آ رو ہی پہنچتا ہے تو یہ دبدا کیسی؟ وہی روز کی باتیں، روز کے آدمی۔ ساس میری دیکھنے میں بری نہیں تھی۔ لیکن کبھی بھنگن ہی اس سے اچھی لگنے لگتی۔ اس لئے جب گھر سے جی بھر جاتا تو میں یہاں آ بیٹھتی۔ تم نے دیکھا ہے نا، بابو کی ماں، یہ بجارچہ نیچے سے یوں ہی سا لگتا ہے۔ لیکن ہے رامائن کا پشپ بوان۔ ایک اٹھ کلیا کمل، لال سیمنٹ کا جسے تھامے کھڑا ہے۔ گھر کی طرف پیٹھ کر کے دیکھو تو نیچے بازار میں سب آر پار دکھائی پڑتا ہے — بھنگی، چمار، کھاد کے نئے کارخانے میں کام کرنے والے مزدور۔ یوں غریب، پر بدن پر محنت کا سرور، چہرے پر صحت کی چمک، سینہ تانے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے چٹان سے چٹان پھوڑنے جا رہے ہیں۔ اس بات کی بھی پروا نہیں کہ مجوری ملے گی یا نہ ملے گی۔ پھراکّے والے جن کی چھاتی کے تسلوں میں گالیاں ہی ابلتی رہتی ہیں، دوسروں کو کم ہی دیتے ہیں، اپنے جانوروں کو زیادہ۔ اپنے آپ کو سب سے زیادہ اور اس پر بڑے خوش مارا ماری کرتے جا رہے ہیں، تیز تیز، جیسے سویرا پورب سے کرنیں پھینکتے ہوئے امنڈتا ہے، اِدھر چھاتا، اُدھر چاپک۔ لوگ یوں اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں جیسے رات کا اپرادھ دن ہوتے ہی کوٹھریوں

میلے کچیلے کپڑوں اور نالیوں میں جا چھپتا ہے۔ سیٹھ، دلال، سٹے باز دھوتی کا پلو سمیٹتے ہوئے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو بیچ سڑک کے جا رہی ہیں اپنی للائنیں، ہر وقت بیٹھے رہنے سے جن کے پیٹ میں ہوا اور پیچھے مانس کے لدوے چلے آئے ہیں، جیسے کسی نے بڑے بڑے تکیے باندھ دیئے ہوں چلتی ہیں تو پیچھے سے 'بدھ دیر بدھ دیر' کا جاپ ہوتا ہے۔ پرساد کی تھالی ہاتھ میں، پانڈے جی ساتھ میں، دنیا جہان سے بے خبر۔ برائے نام گھونگھٹ کاڑھے، پتہ نہیں کس مندر کو جا رہی ہیں؟ بڑے سے بڑا توبے کا ڈنڈا بھی ان راستے کے پتھروں کو نہیں ہٹا سکتا۔ پھر اپنی جات برادری کے سیٹھ، جات باہر کے بیوپاری، جن کی ہڈیوں تک میں پانی پڑ گیا ہے۔ بیچ رانوں کی تھیلیاں، جن کی ڈوریاں تک کمر میں بندھی دکھ رہی ہیں، تس پر بھی چھوکریوں کو گھور رہے ہیں۔ گھورتے مُشٹنڈے بھی ہیں لیکن ایک کی نگاہ میں پل پڑنے والا پیار اور آشا، دوسرے کی نظروں میں گھن اور نراشا۔ چھوکریاں بھی تو ان سے نہیں شرماتیں، شرمائیں کس سے؟

ایسی باتیں دیکھ کر جی اور گھبرا جاتا ہے۔ پھر میں سامنے دیکھ لیتی ہوں۔ پورا مارواڑ دکھائی پڑتا ہے۔ پتھر ہی پتھر، ریت ہی ریت۔ سورج کی روشنی آڑی پڑتی ہے تو ریت کی کنی کنی دمک اٹھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اَن گنت مُہریں پڑی ہیں، اٹھا لو اور اندر باہر سب کہہ لو، دیش بھر کا سونا روپا اسی دھرتی میں چلا آیا ہے۔ بس یہی جھوٹی چمک دمک ہے۔ ہریالی کہیں بھی نہیں۔ کہیں کوئی جھاڑی یا کشل دوب دکھائی دے جاتی ہے، لیکن پیڑ نام کو نہیں۔ دور دندھیا کے آنگن میں کوئی ٹھنسا کا پیڑ

کھڑا ہے یا چنبل کے کنارے بجاسل پھر ہلا رہا ہے، وہ بھی نیچے سے ٹنڈ منڈ اوپر ایک گچھا سا ہے وہی دل کی دھڑکن تیز کر رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کوئی ہمارا سب سونا لے لے اور تھوڑی ہریالی دے دے۔

ماں متی میری ساس، مجھے ہمیشہ یہاں بیٹھنے سے منع کرتی ہے لیکن جب بھی میں یہاں بیٹھتی ہوں، ضد کے ساتھ، ٹھینگے کی طرح۔ اس کا کہنا ہے کھڑکی میں بیٹھنا کام نہیں بہو بیٹی کا۔ کھڑکی میں بیٹھتی ہے تو گنکا۔ میں کہتی ہوں، یہی حساب ہے تو پھر ہماری طرح سبھی گھریلو عورتیں گنکا ویشیا ہیں۔ ہمیں کھڑکی جھروکا بھی نہ ملے تو اس سے مر جائیں۔ ہے نا بابو کی ماں؟ کھڑکی کے لئے عورت ہو نہ ہو، عورت کے لئے کھڑکی بڑی ضروری ہے۔

لیکن اس دن ہمیں کون ٹوک سکتا تھا؟ گوکل اشٹمی کا دن تھا۔ گوپیوں کے کاہن آج کے دن پیدا ہوئے تھے۔ رادھا بازار میں بڑی گہما گہمی تھی۔ رام رام! ساری لوکائی امنگ کی طرح باہر چلی آئی تھی اور ترنگ کی طرح ناچتی، گاتی، بل کھاتی جا رہی تھی ... سانول داس کے مندر کی طرف۔ ان میں عورتیں بھی بہت تھیں جیسے ان کے بنا سب ادھورا ہے۔ دھکے پڑتے تو برا برا منہ بناتیں، اوپر سے گالیاں دیتیں بھیتر سے خوش۔ ایسا نہ ہوتا تو باہر ہی کیوں نکلتیں۔ یہ عجیب بات ہے ہم عورتیں جس بات کو پسند نہیں کرتیں، آخر میں وہی کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے میں غلط کہہ رہی ہوں، لیکن ہمارے من کا پسارا تو کھلا ہی رہتا ہے۔ مردوں کو اس بات کا کیا پتہ؟ وہ تو سارا پڑھ لکھ کر بھی جانگلی ہی رہتے ہیں۔ بس سیدھے، فلاں کام کرو، نہیں تو ہم جان سے مار دیں گے۔ یا خبردار

جوساوتری کے ساتھ منڈوے کو گئی۔ وہ اچھی عورت نہیں، ہوٹلوں میں جاتی ہے۔ کوئی پوچھے تم کو کیسے پتہ ہے جی؟ نہیں جانتے۔ جتنی دیر میں ان کے من میں ایک وچار آتا ہے، ہمارے من سے بیسیوں ہو کے نکل جاتے ہیں۔ ہاں، تو اس دن سب عورتیں کھڑکیوں میں چلی آئیں۔ جڑت مڑت، رنگ، بانکڑی اور گہنوں کی نمائش تھی۔ سب ایک عجیب خواہش سے نیچے بازار میں دیکھ رہی تھیں — پلّو سر سے ہٹے ہوئے، چوٹیاں نیچے کو لٹکی ہوئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سیڑھیاں ہیں جو گھر کے بھیدی نے باہر لٹکا رکھی ہیں۔ تاکہ باہر کا چور ان کے سہارے چلا آئے اور آنکھوں کی کھڑکی سے اندر کود پڑے۔ پھر کیا ہے۔ سامنے تجوری پڑی ہے، تالی گھر والوں کے پاس ہے، ہمت ہے تو توڑ لے۔

کہاں تو اکیلے ہی بیٹھی تھی، کہاں روپ متی، ساس، وڈّا بھی آگئیں جبھی پتہ چلا وڈّا تو کب سے آئی بیٹھی تھیں۔ اندر کے مندر میں گھنٹی بجارہی تھیں۔ وڈّا اور ساس دونوں باہر دیکھ رہی تھیں۔ لیکن چہرے پر کوئی اثر نہیں۔ منہ بیرنگ لفافے کی طرح۔ پیسے دو اور چھڑا لو، نہیں تو بھیجنے والے کو واپس۔ ہاں رد پو کا منہ کھلا تھا۔ میں نے کہا "رد پو! تو اِدھر آجا، میرے پاس"

بولی: "نہیں بھابی میں ٹھیک ہوں"

پیچھے سے وڈّا بولیں۔ "ارے! پیار سے بلاتی ہے، جاتی کیوں نہیں؟"

رد پو نے شک بھری نظر سے میری طرف دیکھا جیسے مجھے اس کی کسی بات کا پتہ چل جائے گا۔ میں نے یوں دیکھا جیسے نہیں چلے گا اور

اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ میں نے اپنی بانہہ میں جو اسے جکڑا تو پتہ چلا کہ اس کے کولھے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ ایک سال پہلے یہی روپ کچھ بھی نہیں تھی، اب سبھی کچھ ہے۔ ابھی تو میں نے اس سے پیار کی اک بات بھی نہ کی تھی کہ ساس کی آواز آئی: "بہو سر ڈھک اپنا، کیسے بیٹھی ہے؟"

میں نے اسی دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سر ڈھکنے لگی۔ ہیں تم سے سچ کہتی ہوں بابو کی ماں، مجھے پتہ نہیں تھا کہ میرے سر پر کپڑا نہیں ہے، ننگی ہی بیٹھی ہوں ان عورتوں کی طرح جو سامنے بخار پیٹے میں کھڑی تھیں، اور تن من سبھی کو ہوا لگوا رہی تھیں۔ میں پھر دونوں ہاتھ یہاں کھڑکی میں ٹکا ان پر ٹھوڑی رکھے نیچے دیکھنے لگی۔

نیچے عورتیں تو اب کہیں کہیں تھیں، مرد ہی مرد تھے چھوٹے اور کوئی لمبا، کوئی ناٹا، کوئی چھوٹا، کوئی موٹا، کسی نے داڑھی بڑھا رکھی ہے تو کوئی صفاچٹ، لیکن سر کے بالوں کے گھونگھر بنا کندھے پر چھینک رکھے ہیں۔ کوئی پان کھا رہا ہے اور تھوک رہا ہے، کوئی بیڑی کی راکھ چٹکی سے گرا تا ہے، کوئی لڑتا ہے۔ کوئی گالی کھاتا ہے۔ لیکن اوپر کو سب دیکھ لیتے ہیں بجلی کے تاروں کی طرف . . . .

اس سال کچھ زیادہ ہی مرد تھے۔ ایک دم یہ اتنے کہاں سے چلے آئے پھر میں نے سوچا، آخر ماؤں نے ہی جنے ہیں۔ آسمان سے تو نہیں ٹپک پڑے . . . . بیچ میں ایک ٹھٹھ سا بندھا تھا اور باقی سب کے سب اس کے چاروں طرف گھیرا بنا کر کھڑے تھے۔ ان کے سروں پر کوئی سات گز کی اونچائی پر ایک رسّی لٹک رہی تھی۔ جس کا ایک سرا رنگریزوں کے گھر اور دوسرا چھندواڑے کے سیٹھ کے یہاں بندھا تھا اور اس رسی کے

ہمارے بازار کے بیچوں بیچ مٹکی لٹک رہی تھی، یہ وہی مٹکی تھی جس میں ماتا جسودھا مکھن رکھ دیا کرتی تھیں اور اوپر ٹانگ دیتی تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں نٹ کھٹ اس تک نہیں پہنچ پائے گا لیکن وہ اپنے ساتھیوں کے کندھوں پر چڑھ کر پہنچ ہی جاتا تھا۔

تو اس گھیرے میں سے نکل کر کچھ آدمیوں نے دوسروں کے کندھوں پر چڑھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال، اندر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر دوسرا دل آیا، تین آدمیوں کا اور پہلے چھ آدمیوں کے کندھوں پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ آخری بھیڑ میں سے سانولے رنگ کا ایک نوجوان لڑکا نکلا اور پھرتی سے باقی سب کے کندھوں پر یوں چڑھ گیا جیسے وہ آدمی نہیں، سیڑھیاں ہوں۔ اوپر پہنچ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی قمیص میلی تھی اور اس پر رنگ گرا ہوا تھا بٹن کھلے تھے۔ ... میں تو تم سے سب بات کر سکتی ہوں بابو کی ماں، جیسے تم مجھ سے کر لیتی ہو۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ اس لئے بھی کہ اس کے پاؤں ابھی جمے نہیں تھے، وہ گر بھی سکتا تھا۔ ایک دم اس کے پاؤں تھرائے اور وہ جھک گیا اور پھر اسی دم تن کے کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے پاؤں جم چکے تھے ......

لوگوں میں اک شور سا مچ گیا۔ وہاں کھڑے ہوتے ہی اس لڑکے نے سیدھے اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ ایک بجلی سی میرے شریر میں دوڑ گئی۔ پھر اس لڑکے نے دونوں ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے میں گاڑ دیئے اور سر کے اوپر اٹھا، ہاتھ ہلائے، کانپا سنبھلا ...... مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے خون میرے منہ کو آ رہا ہے، میری

کنپٹیاں تک کانپنے لگیں۔ آخر میں اس نے ایک ہاتھ اوپر کر کے مٹکی تھام لی۔ لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ مٹکی تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس نے دونوں ہاتھوں میں اسے تھام رکھا تھا۔ اس نے پھر اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ روپو بیٹھی تھی، ساس اور ددا بیٹھی تھی۔ مجھے ایسا لگا، جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے، جیسے وہ مجھے جانتا ہے۔ میں نے اسے دیکھا ہے لیکن نہ جانے کتنی پرانی بات ہے جس میں وقت نے تصویر کو دھو ڈالا ہے، ریکھائیں سی رہ گئی ہیں۔

...... میں نے چور نظر سے روپو کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک منہ کھولے بیٹھی تھی، جیسے بچے تماشے میں منہ کھول کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا بدن جل رہا ہے۔ اس میں سے سینک نکل رہا ہے اور آس پاس بیٹھی عورتوں کو لگ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے مجھ سے بدبو اٹھ رہی ہو گی لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔

اب تک میری جیٹھانی بھی آ بیٹھی تھی۔ ایک میں تھی جس کے یہاں لاکھ جتن کرنے پر بھی کوئی بچہ نہ ہوا، اور ایک وہ تھی ہر سال جس کے ہو جاتا تھا اور جسے وہم کی بیماری ہو گئی تھی۔ ایک میں تھی جسے کوئی چیز گندی نہ دکھائی دیتی تھی اور ایک وہ جسے ہر چیز گندگی سے پٹی معلوم ہوتی تھی۔ ہر وقت ہاتھ، منہ، کپڑے دھوتی رہتی، خاص کر نل۔ اب بھی وہ نل کو راکھ سے مانجھ کر ہاتھ دھوتی ہوئی چلی آئی تھی۔ ہاتھ تولئے سے نہ پونچھے تھے کیونکہ گھر میں ہر آتا جاتا اسی تولئے کا استعمال کرتا تھا۔ آ کر اس نے گیلے ہاتھ جو جھٹکے تو پانی کے چھینٹے مجھ پر پڑے یوں لگا جیسے اور ٹلگی زمین پر برکھا کی پہلی بوندیں پڑی ہوں ۔۔۔۔

... ... میں نے مڑکر دیکھا، رد پوجا چکی تھی۔ شاید میرے پاس بیٹھ کر اسے سینک لگ رہا تھا یا پھر وہی اس کی بھید بھری حرکتیں! کبھی پتہ نہ چلا اس کا، اگلے پل کیا کرے گی۔ اتفاق سے نظر نیچے گئی تو وہ اسی ساج کے پھاٹک کے باہر کھڑی تھی اور اشٹمی کے جلوس کو دیکھ رہی تھی جس میں وہ لڑکا بیے لمبے ہاتھ ڈال کر مٹکی کے پانی کو باہر گرا رہا تھا پھر وہ ہاتھ مار مار کر اسے توڑنے لگا لیکن وہ مٹکی جانے کس مٹی سے بنی تھی، ٹوٹتی ہی نہ تھی۔ آخر میں وہ اسے مکے مارنے لگا۔ جب اس پر بھی نہ ٹوٹی تو اس نے مٹکی میں اپنا سر مارنا شروع کر دیا۔ مجھے کیا ہوا میری آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں۔ پھر تھوڑا کھلیں تو وہ ابھی تک سر مار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پھر آنکھیں موند لیتی، مٹکی پھوٹ چکی تھی اور لوگ شور مچا رہے تھے ... ...

لڑکے نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سر کو ضرور کچھ چوٹ لگی تھی لیکن چہرے سے اس نے کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے جیب سے ایک میلا کچیلا رومال نکالا اور گردن پونچھ لی۔ پھر وہ اپنے آپ جھک گیا اور ہوئے ہوئے نیچے اترنے لگا۔ اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ نیچے کے گھیرے پر پہنچکر وہ لڑکھڑا گیا۔ وہ گرا ..... میں لپکی لیکن ان گنت لوگوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے بچا لیا۔ ردّا نے میری طرف دیکھا اور ہنس دی۔ ساس نے ناک بھوں چڑھائی۔ میں وہیں بیٹھی رہ گئی۔ نیچے دیکھا تو لڑکا کہیں بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔ میں یوں ہی مور کھوں کی طرح اس طرف دیکھ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا، نیچے لپک جاؤں اور اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کے پوچھوں، کہیں بہت تو نہیں لگی؟ لیکن ... ... میں

یہاں سے ایک دم کیسے جا سکتی تھی باہر؟ صدیوں کی بنی رسم کو پل بھر میں کیسے توڑ دیتی؟... من کو مار کے یہیں بیٹھی رہی اور سوچتی رہی ——

رات آگئی، اشٹمی کی رات۔ میرا من تب تک بہت بوجھل ہو چکا تھا تنکا توڑ دوہرانہ کیا تھا، پر اِتنا تھک گئی تھی کہ بس... آج گھر میں ایک چیز کام کی ہوئی اور وہ یہ کہ ارہر کی دال نہ بنی تھی اور نہ اُردو کی، نہ کڑھی۔ میری جیٹھانی نے کٹھل کی وہ پیاری سبزی پکائی تھی کہ زبان سے الگ نہ ہوتی تھی۔ بالکل مانس کا سواد تھا۔ ہاں، بابو کی ماں، تم سے کیا چھپانا؟ میں نے مانس کھایا ہے، چوری چوری کئی بار کھایا ہے۔

روپو آگئی۔ ویسے ہی بے وجہ ہنستی ہوئی۔ یہاں بستر سے اٹھنا دوبھر ہو رہا تھا لیکن وہ تھی کہ اپنے ہلکے پاؤں پر اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھسلتی جا رہی تھی۔ اتنی چہک اس میں کہاں سے چلی آئی۔ میری طرف شرارت سے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

"بھیّا کب آنے والے ہیں چھوٹی بھابی؟"

میں نے کہا: "کیوں؟"

روپو سمجھتی تھی کہ اس کے بھائی کے نام پر میں شرما جاؤں گی۔ جیسے دوسری عورتیں اپنے پتی کے نام پر شرما جاتی ہیں۔ لیکن ہمارا بیاہ کوئی نئی بات نہ تھا اور شرمانے کی اتنی بات ہی کہاں رہی تھی۔

روپو بولی: "پتہ بھی ہے آج ہنڈولے ہیں؟ وہ جھونٹا دیتی کہ آسمان سے جا لگتیں۔"

"اونہہ" میں نے منہ بنا کر کہا اور چپ ہو گئی۔

—— روپو جنم اشٹمی کے دن مجھے اور اپنے بھیّا کو جھولے میں بٹھا کر

بہت خوش ہوتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا مزہ آتا تھا۔ شاید وہ سمجھتی ہو گی کہ رادھے شیام کی جوڑی ہے! جب کبھی لمبا اور تیز جھونٹا دیتی تو میں ڈر کر "اِن سے" چمٹ جاتی اور روپو دیکھ کر بہت ہنستی۔ بیچ میں میں دو ایک بار گر گئی اور یہ مجھے تھام نہ سکے۔ میری جیٹھانی کے بچوں نے بیر کھا کھا کر گٹھلیاں جگہ جگہ پھینک رکھی تھیں۔ ایک میرے سر میں گھس گئی۔ تب سے میں نے جھولے ہنڈولے پر بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ بیٹھتی بھی تو ان کا' سہارا لینے کے بدلے رسی تھام لیتی جس سے روپو کے سب تماشے کا تماشہ ہو گیا!

روپو بیٹھی رہی اور طرح طرح کی شرارتیں کرتی رہی۔ کبھی وہ میرا کے بھجن گانے لگتی، کبھی باجے میں فلمی ریکارڈ لگا دیتی اور تالی بجا بجا کر ساتھ ناچنے لگتی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔۔۔ تب تک ان کے پتا اور بڑے بھائی آ گئے تھے۔ میں جانتی تھی دادا، ساس اور جیٹھانی ہنڈولے دیکھنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ اب سانول داس کے دیول جانے کے لئے کسی نے کہا تو کیا بہانہ کروں گی؟ تبھی مجھے اس لڑکے کا خیال آ گیا جس نے مٹکی پھوڑی تھی۔

"روپو تونے دیکھا تھا آج کا جلوس؟"

روپو نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی "ہاں بھابی۔"

میں نے پوچھا "اور وہ تماشا دیکھی تھی؟"

روپا بولی "ہاں۔"

"اور وہ لڑکا؟"

روپو نے پہلے انکار میں سر ہلا دیا اور پھر اقرار میں۔ وہ اتنی جلدی میں تھی کہ کچھ فیصلہ ہی نہ کر پائی۔ اس نے تیز نظر سے مجھ کو دیکھا اور چپ

کھڑی رہ گئی۔

میں کچھ نہ سمجھی، الٹا میں ہی پوچھنے لگی: "کون لڑکا بھلا؟"

رو پو نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا: "مجھے کیا معلوم"۔

"ارے وہی"! میں بولی: "مٹکی پھوڑ . . . ."

اور صرف رو پو کو چھیڑنے کے لئے میں نے کہہ دیا: "کیسے تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر ہاتھ ہلاتا تھا، اشارہ کرتا تھا، جیسے اچھی طرح جانتا ہو"۔ میں چاہتی تھی، رو پو مجھے چھیڑے، مجھ سے کہے: "وہ تمہیں بلا رہا تھا، بھابی"۔ . . . لیکن رو پو چپ رہی، نہ صرف چپ . . . . اس کی سانس تیز ہو گئی۔ اس نے پھر مجھے دیکھا، جیسے میرے اندر کی کوئی چیز ٹٹول رہی ہو۔ ایک پل کے لئے تو میں بھی گھبرا گئی۔ پر میں نے سوچا کہ میں نے کیا کیا ہے جو خواہ مخواہ کی چور بنوں۔ میں نے دلیری سے رو پو کو اور بنانا شروع کر دیا۔ جب وہ بہت گھبرائی تو میں سمجھی، اس کی تو عادت ہے۔ مجھے کیا پتہ، آج کیا ہونے والا ہے۔ میں نے مسکراتے، سر ہلاتے ہوئے کہا: "کیسے سر مار مار کے مٹکی پھوڑی تھی اس نے"۔

رو پو اسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی۔ میں نے دیکھا، بغل سے اس کی دھوتی پھٹی ہوئی تھی اور اس پر خون کے کچھ دھبے تھے . . . .

رو پو سال بھر سے رجسبولا ہو گئی تھی۔ میں نے من ہی من میں کہا: وہ پھر شروع ہو گیا ہے اور یہ پھوہڑ نہیں جانتی۔

"دھوتی تو بدل کنیا"! میں نے لفظوں کو تھوڑا چباتے ہوئے کہا: "پھٹی پڑی ہے، سب خون لگا ہے"۔

رو پو کچھ مڑی اور دھوتی میں پھٹی ہوئی جگہ اور خون کے نشانوں

کو چھپاتے ہوئے بڑبڑا کر باہر نکل گئی۔ میں نے اس واقعہ کو کوئی ایسا نہ سمجھا ایسا تو الگ بھگ ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے، جب وہ عورت بنتی ہے۔ ہوتے ہوتے وہ اپنے آپ کو سنبھالنا سیکھ لیتی ہے۔ کئی تب بھی پھوہڑ ہی رہتی ہیں ... میں نے سوچا یہ بھی پھوہڑ ہی رہے گی، روپو۔

رات جو کچھ ہوا، اس سے مجھے پتہ چلا، یہ سب جادو "کیتا" کے لفظ نے جگایا ہے۔ مجھے کیا معلوم، بابو کی ماں، تو تو جانتی ہے، ہم یونہی پیار سے بھی ایک دوسرے کو کیتا کہا کرتی ہیں۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ ہم ہنڈولے پر گئے۔ روپے پیسے، سونے چاندی کی ہمارے دیش میں کیا کمی ہے؟ کنجوس لوگ پیسے پیسے کے لئے مرنے والے ... شادی بیاہ، تیج تیوہار پر سب کونوں کھدروں میں پڑی پونجی اٹھا لاتے ہیں اور بیچ چوراہے کے رکھ دیتے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں —— دیکھو، دیکھو اور جلو، میں کیرت داس ہوں، جس کی دھن باد میں کوئلے کی تین کانیں ہیں، کلکتہ میں ربڑ اور پلاسٹک کا سب سے بڑا کارخانہ، بمبئی میں کاٹن گرین کے گودام اپنی روئی سے بھرے پڑے ہیں ......

توسانول داس کے دل میں لاکھوں کا چڑھاوا چڑھ گیا۔ میرے سسر نے مورتیوں پر سونے کا پتر چڑھوا دیا اور شیام سندر کی آنکھوں میں بڑے بڑے نیلم لگوا دیئے!

میں اگرچہ تھکی ہاری تھی، لیکن ساتھ چلی گئی۔ یوں ہی ...... ایک آشا کے ساتھ۔ اور کچھ نہیں تو چہل پہل ہی دیکھ لوں گی۔ گھر میں کیا رکھا ہے۔ پڑی رہی تو اپنے آپ کو کھا جاؤں گی۔ وہاں بھیڑ میں سوا دو چار دھکوں کے کچھ نہ ملا ... اور اس کے بعد ہم گھر چلے آئے، روپو نہیں

آ ئی تھی۔ سب خوشامد کرتے رہے پر روپو نے ایک ہی نہ پکڑ لی تھی۔ سب جانتے تھے یہ ایسا ہی کرتی ہے، اس لئے ساری پرواہ کے ہوتے ہوئے بھی کسی نے پرواہ نہ کی۔

لوٹتے سمے اور گھر پہنچکر میں نے بار بار سوچا۔ یہ ہی آجائیں۔ لیکن انہیں کیا پڑی تھی۔ انہیں تو دیش بھر کی ارنڈی چاہئے تھی، دنیا بھر کی دولت چاہئے تھی۔ پیسے اور پیسے کے علاوہ انہوں نے کچھ سوچا، نہ ان کے باپ دادا نے۔ ہماری کتنی اچھا ہوتی ہے بابو کی ماں، ہم اپنے پتی کے ساتھ باہر جائیں میں تو کہتی ہوں۔ اس بات میں پتی پریم بھی اتنا نہیں ہوتا جتنا یہ دچار ہوتا ہے کہ باہر جائیں، اپنے آپ کو دکھائیں اور جب کوئی دیکھے تو اپنے ہی آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیں اور کہیں، بھگوان نے سب دیا ہے، تم کیا سمجھتے ہو۔ تم بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لو، آہیں بھرو۔۔۔ ۔۔ جلو، مرو۔۔۔۔

ہاں، ہم اتنا ہار سنگھار، گہنے کپڑے کیوں پہنتی ہیں؟ اسی لئے نا کہ کوئی دیکھے، کوئی ہاتھ نہ بڑھائے اور پھر اس انکار میں کتنا اقرار چھپا ہے۔ من کے کسی کونے میں ایک چیز پڑی رہتی ہے، جو آتے جاتے من چلے کی ہمت کو للکارتی ہے۔۔۔

گھر آتے ہی میں سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے دروازہ بند کر کے میں نے سب کپڑے اتار دیئے اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ کبھی اِدھر سے، کبھی اُدھر سے۔ پھر بتی بجھا کر ایسے ہی بستر پہ لیٹ گئی۔ باہر کسی نے ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں چونک پڑی۔ "کون ہے" میں نے پوچھا۔

دھیرے سے آواز آئی "میں، روپو۔"

میں نے پاس پڑی چادر لپیٹ لی اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ روپو اندر آئی۔ وہ رو رہی تھی، روئے جا رہی تھی۔ آتے ہی وہ میرے پاؤں پر گر پڑی، اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی "میری لاج رکھ لو بھابی، میں مر جاؤں گی کسی سے کہہ دیا تو میں کہیں کی نہ رہ جاؤں گی۔"

میری سمجھ میں جب تو کوئی بات نہ آئی۔ لیکن ہم عورتیں۔ ... میں نے یوں ہی کہہ دیا۔ "نہیں میں کسی سے نہ کہوں گی ...." اور پھر یوں ہی ... "کیا ہوا؟"

روپو بولی "تم ٹھیک کہتی ہو بھابی، وہ مجھے جانتا ہے۔"

"وہ کون؟" میں نے پوچھا۔

"اب بنو مت"! روپو بولی "وہی منکی بھوڑ۔"

"تیرا ستیاناس" میں نے دل میں کہا۔

روپو بولی ۔ "جب بھی میں رادھا بازار سے گذرتی، وہ ناکے پر مجھے مل جاتا، اشارے کرتا، سیٹیاں بجاتا، لیکن میں پاس سے گذر جاتی، بڑے بڑے منہ بناتی، گالیاں دیتی۔ لیکن آج پتہ نہیں مجھے کیا ہوا، میں بھیڑ میں چلی گئی، صرف اس کے ایک انگلی اٹھانے پر ... اور پھر ہم دونوں بھیڑ سے نکل گئے اور شیو مندر میں چلے گئے جہاں یاتریوں کے لئے کوٹھریاں بنی ہیں۔ میں کانپتی جا رہی تھی، آخر میں میں نے سوچا بھی کہ بھاگ کھڑی ہو دوں لیکن مجھ سے کچھ کرتے نہ بنا .... اس کے بعد ہم اندھے ہو گئے۔ ....

میں سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں، میرا سارا شریر کانپنے لگا۔ پہلے

مجھے غصہ آیا، گھن پیدا ہوئی۔ پھر سب کچھ جانے اپنے آپ ڈھل گیا میں جی ہی جی میں اپنی مورکھتا پر ہنسی۔ مجھے تبھی کیوں نہ پتہ چلا جب میں نے رد پو سے یہ سب کہا تھا۔ ابھی بارہ دن ہی تو ہوئے جب ردپو نہائی ..... اور آج ..... "اچھا، اچھا ..... تو چنتا نہ کر" میں نے ردپو سے کہا: "تو نے کون سا ایسا کام کیا ہے جو کسی ماں کی بیٹی نے نہیں کیا۔ لیکن اب تو اپنے آپ کو سنبھال۔ مہینہ بھر اپنا حال بتاتی رہنا ہوئی! کچھ ہو گیا تو کہیں کی نہ رہ جائے گی۔ سویرے میں تجھے میتھرے ابال کر دیدوں گی۔ اب تو سو، رہ، یہیں، میرے پاس۔ کہاں جلے گی اس اندھیرے میں۔ سب سوچیں گے، یہ کیا ہو رہا ہے۔ کون چل رہا ہے اس آدھی رات کے وقت ——

"..... اور سن! میں تیرے بیاہ کی بات چیت چلاؤں گی۔ تو اوں، آں نہ کیجو، کرتا بھی ہے تو بس دکھاوے کے لئے۔ اتنا ہی جتنا ہم سبھی کرتی ہیں۔ مٹکی پھوڑ کوئی یوں ہی سا ہے، راج مجور، اس کی تو سوچ بھی مت ..... ہاں ..... جو بات نہیں اچھی، نہیں اچھی ہے، اور جو اچھی، سو اچھی ہے۔ بھگوان نے تو مرد عورت بنا دیئے اور جب سے دنیا بنی ہے وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، اور بھاگتے رہیں گے۔ جیسے چاند سورج بھاگتے ہیں! لیکن وہ بھی ایک راستے پر جاتے ہیں۔ یہ نہیں اس گلی اُس بازار سے راستہ کاٹا اور پکڑ لیا ایک دوسرے کو۔ ایسا ہو تو یہ دنیا، یہ سنسار، یہ دھرتی، یہ آکاش سب نشٹ ہو جائیں۔ سال کے دن ہی کتنے ہوتے ہیں تین سو پینسٹھ۔ ان تین سو پینسٹھ دنوں میں ایک بار چاند سورج کو اور ایک بار

سورج چاند کو پکڑ لیتا ہے، اور بس ——

.. .. .. اس لئے مُنش نے اس چاند سورج کا بھی راستہ بنا دیا ہے اور وہ ہے بیاہ کا راستہ۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔ بیاہ ہوتا ہے تب ماں، باپ، بھائی بہن خود لڑکی کا ہاتھ لڑکے کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں.. .. .. پھر تو کوئی راجہ مہاراجہ، جج دیوان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

اور میں نے روپو کو چھاتی سے لگا لیا۔ اس کی بہت کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ میرے پاس پڑے پڑے وہیں سو گئی۔ .. .. نیند نہ آئی تو مجھے یونہی جمائیاں لیتی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر کروٹ بدلتی رہی کبھی کبھی میرا ہاتھ روپو کے شریر پر پڑ جاتا۔ لیکن وہ بے ہوش پڑی تھی، سب کچھ کہہ سنکر ایک سکھ کی نیند لے رہی تھی اور میں .. .. ..؟

مٹکی پھوڑ.. .. روپو کے بھیا .. .. .. روپو .. .. .. آئینے میں اپنا شریر، سبھی کچھ سامنے گھومتا رہا۔ پھر میں سوچنے لگی، یہ جو روپو سے کہتی رہی ہوں، سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ سچ اس لئے کہ کوئی اصول تو ہونا ہی چاہئے۔ یوں ہی مرد عورت ایک دوسرے سے ملتے پھریں .. .. .. تو اولاد کو کون سنبھالے، پرواہ کیسے بنیں .. .. ..؟ اور جھوٹ اس لئے کہ بیاہ کے ایک دو سال تک سب ٹھیک رہتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے عورت مرد ایک دوسرے کو اتنا جان لیتے ہیں کہ پھر کچھ جاننے کی بات ہی نہیں رہتی۔ جیسے کوئی آدمی ہر سال آبو جایا کرے یا سوہر تحصیل کے ہزاروں چکر کاٹ ڈالے پھر مسوری کی گھاٹیوں پر چڑھنے کا مزا ہے، نہیں آتا سو جاتی ہے اور ہوتے ہوتے شریر بھی مردہ ہو جاتا ہے، تبھی تو.. کسی

دوسرے کا ہاتھ لگے، تو مٹر یا اور آتما دونوں چونک کر جاگ اٹھتے ہیں۔ شادی شدہ جیون میں یہ سب ہو سکتا ہے، اگر عورت میکے ہی جاتی رہے یا مرد دورے پر چڑھا رہے۔ کسی ایسی بڑی ریلوے کا گارڈ ہو جو مہینوں بعد گھر لوٹتی ہو۔۔۔۔ تب بھی تبدیلی پر کرنی کا اصول ہے۔۔۔۔ سدا گرمی نہیں رہتی، یہ سردی رہتی ہے۔۔۔۔ شکل پکش کی رات کا اپنا جادو ہے اور کرشن پکش کی رات کا اپنا۔۔۔۔ سانپ کی کھال بھی اچھی ہے اور مور کے پنکھ بھی۔ بھر رنگ ہیں، خوشبوئیں ہیں، سُوَر ہیں۔۔۔۔ ان جانے، ان گنت۔

شادی بہت اچھی چیز ہے لیکن کیا ایسا سمے نہیں آئے گا اگر اس میں تھوڑی سی تبدیلی ہو جائے؟ یہ مرد عورت دونوں سے ایک ہی بات کہیں۔ اس چھت کے نیچے تم دونوں رہو گے۔ یہاں جو سنتان پیدا ہو گی، آدمی کی ہی ہو گی۔ مرد باہر کام پر جایا کرے گا، عورت گھر سنبھالے گی اور بس۔۔۔۔ ہے بھگوان! میں کیا کچھ کہہ گئی۔ لیکن بابو کی ماں میں سچ کہتی ہوں، مجھے کئی بار خیال آتا ہے میں بیوی ہونے کی جگہ ان کی پریتما ہوتی تو کتنا خوش رہتی!

ساری رات میں نے جاگ کر کاٹی، ساری رات میں سولی پر ٹنگی رہی۔ جب بھور ہوئی تو یہ چلے آئے۔ میں لپک کر دروازے کی طرف گئی۔ لیکن انہیں مجھ سے بات تھوڑے کرنی تھی، میری طرف تو دیکھا بھی نہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا ہی کہہ دیتے کہ ہاں بھائی، تو بھی کوئی ہے۔ باہر جانے والے کا کیا ہے، ہزار روپ دیکھ کے آتا ہے۔ ہم ہی گھر میں ایک سا دوسرے کا منہ تاکا

کرتی ہیں اور بڑے بڑے باسی روٹی کی طرح ہوجاتی ہیں۔ ہاتھ لگاؤ تو ٹھنڈی ٹھار، کھاؤ تو گرم ۔۔۔

ارنڈی کا سوداگر! ہونہہ! ۔۔۔ پگڑی تو دیکھو، کیسے پیچ کے پیچ گلے میں پڑے ہیں، جیسے مار کھا کے آیا ہے اور منہ پر انجن کے کوئلے کا برادہ پڑا ہے ۔۔ ۔۔ بیم دہشت معلوم ہوتا ہے ۔۔۔۔ گھر میں اور کسی کو جانے کی ہمت نہیں تھی، سوا دڈا کے ۔۔ ۔۔ دڈا گئیں، تو ان سے بولے "دڈا جی! اسے کہو کچی لسی کا گلاس بنا دے۔"

اس ساری نفرت کے باوجود میں اپنے آپ چل دی لسی بنانے۔ وہی صدیوں کی عادت، پل بھر میں گھوڑے چلی جاتی ہے۔ میں نے جی میں کہا، بڑا آیا ہے حکم چلانے، جیسے میں کوئی لونڈی باندی ہوں، ہاتھ جوڑے کھڑی ہوں، حکم کی غلام! لیکن میں نے جلدی سے کچی لسی بنا ڈالی۔ رو پو ابھی جاگی تھی، لپک کر جو باہر نکلی تو گلاس سے ٹکرائی۔ لسی سے میرے کپڑے تر ہو گئے ۔۔ ۔۔ پھر جو بچی تھی بھیجدی۔

میں تم سے سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں! رات تک باپ اور دونوں بیٹے باہر نہیں نکلے آپس ہی میں کچھ کھسر پھسر کرتے رہے۔ میں نے سوچ لیا، یا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر گیا اور یا پھر سب کچھ بک گیا۔ یہ ارنڈی چیز ہی ایسی ہے۔ اگر تم اسے دیکھو تو بالکل پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی کی قسمت بنا سکتی ہے اور بگاڑ سکتی ہے۔ ہمارے دیش کی ارنڈی، تو ریا اور مونگ پھلی! ان میں وہ طاقت ہے جو کسی دوسرے دیش کی دودھ ملائی میں نہیں۔ کسان ہل جوتتے ہیں ۔۔ ۔۔ بیج بوتے ہیں، کارخانے میں مزدور کام کرتے ہیں لیکن ان کی قسمت کا فیصلہ

ان کمروں میں بیٹھے بیٹھے وہ لوگ کروڑ لیتے ہیں جو ہل چلانے میں نہیں، بونے میں نہیں، محنت مجوری کرنے میں نہیں۔

میں چاہتی تھی، باہر آئیں تو آج ان سے دو باتیں کروں اور کہوں پیسے کے بچار یو! ایسی دنیا بھی ہے جو پیسے کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکتی، جیب سے پیسے نکال کر یوں پھینک دیتی ہے اور آگے چل دیتی ہے۔ دیکھو تو تمہارے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مہریں، سونے چاندی، ہیرے جواہر کی کان میں تم نے ہم سب کو بندی بنا رکھا ہے اور ہم بھوکوں مر رہی ہیں، ہیرے جواہر تو نہیں کھا سکتیں۔

وہ نکلے۔ ۔ ۔ ۔ باپ اور دونوں بیٹے۔ ۔ ۔ ۔ نہ چہرے پر خوشی، نہ دکھ ـــــ اور پھر گھر سے باہر چل دیئے۔ ہم عورتیں ہکا بکا کھڑی رہ گئیں۔ سوچنے لگیں، آج ادھر میں کچھ کالا کالا ہے! دوڑا آئیں اور بولیں: "ادنڈی میں دس بارہ لاکھ کا گھاٹا پڑا ہے اور یہ لوگ دیوالے کے کاغذ لکھنے جا رہے ہیں۔ کل کچہری کھلے گی تو داخل کر دیں گے۔"

دیوالہ!۔ ۔ ۔ ۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو بالو کی ماں؟ تمہارے لئے دیوالہ مر جانے کی بات ہے، ان سیٹھوں کے لئے نہیں۔ یہ تو جتنے دیوالے نکالیں اتنے ہی امیر سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے ہر دیوالے میں یہ کچھ اوپر نیچے کر جاتے ہیں جس سے لاکھ دو لاکھ کا منافع ہوتا ہے، نقصان نہیں۔ اس سے پہلے میرا سسر اور اس کے بیٹے چار دیوالے نکال چکے تھے اور یہ پانچواں تھا۔

رات بھر یہ مردلوگ نہ آئے! دن بھر کچہری میں رہے۔ شام کو میں اسی بچارچے میں بیٹھی تھی۔ سامنے اپنے سسر کو دیکھا، کمر کی طنابیں ڈھیلی

کرتے ہوئے، میرے جیٹھ کی موٹے شیشے والی عینک ناک کی جڑ پر آگئی تھی اور منہ پر کھوڑی اور کا لک پت گئی تھی۔

دو سال تک انہوں نے روپا کا کچھ نہ کیا۔ میں نے پہلے اس بیچاری کے خیال سے صاف صاف کچھ نہ کہا، اشارے اشارے میں سب کہہ دیا۔ لیکن انہوں نے میری نہ مانی۔ کوئی دھنی گھر دیکھنے میں وقت بے کار گیا۔

روپو نے اتنے عرصے میں زمین آسمان ایک کر دیا۔ اسے اب ہر آدمی مٹکی پھوڑ نظر آتا تھا۔ کب تک گلی محلے کی نظروں سے یہ بات چھپی رہ سکتی تھی۔ آخر میں ان تینوں باپ بیٹوں نے مل کر روپو کو خوب پیٹا۔ چھڑانے میں مجھے بھی پڑ گئیں۔ پھر انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ روپو کو تو کچھ زیادہ محسوس نہ ہوا، میں پاگل ہو گئی۔ اندر جاتی تو رو لیتی، باہر آتی تو رو لیتی۔ میں نے ساس کی خوشامدیں کیں، دیوتا کے سامنے ماتھا رگڑا اور کہا، کیا یہ ضروری ہے، اچھا سا لڑکا دیکھو جو کھاتا کماتا ہو، باپ سیٹھ نہ ہو تو کسی اچھی نوکری میں ہو۔ لیکن وہ کسی ایسے کی کھوج میں تھے جو ان کی جات، برادری کا ہو، جس سے بیوپار کا ناطہ بھی بڑھے۔ لیکن ایسا کوئی نہ تھا۔ تھا بھی تو بڑی ناک والا۔ بہت پیسے مانگتا تھا۔ ... لاکھ دو لاکھ کی بات بھی نہیں، پانچ لاکھ!

روپا کھل کھیلنے لگی۔ اس نے صاف کہہ دیا، بیاہ کروں گی تو اسی مٹکی پھوڑ سے۔ مٹکی پھوڑ کا اصل نام شیتل داس تھا، اور وہ آتشبازی کی دکان کا مالک تھا۔ آمدنی کوئی اتنی زیادہ نہ تھی لیکن دیوالی کے ادھر ادھر اتنا پیسہ کما لیتا تھا کہ سال بھر کے لئے کافی ہو۔ خود تو شیتل داس

تھا، پر کام ہوائی پٹاخے کا، اپنا من شیتل ہو یا نہ ہو لیکن دوسرے کا ضرور کر دیتا تھا۔ ۔۔ ویول نگر میں دو چار ہی بانکے تھے جن میں سے ایک وہ بھی تھا ۔۔۔ ۔۔ ہر کھیل تماشے میں آگے، راس لیلا کا بندوبست اسی کے سپرد۔ وہ مہابھارت کا کنس تھا اور رامائن کا راون!

لیکن روپوا اب اس سے نہ مل سکتی تھی۔ نہ اسے گوکل اشٹمی کے دن سانول داس کے دیول میں جانے کی اجازت تھی اور نہ رام لیلا دسہرے میں حصہ لینے کی چھٹی۔ مجھے تو اسے دیکھ دیکھ کر ترس آتا تھا، میرے من میں جانے کیا کرانتی کی لہر اٹھی، شیومندر جانے کے بہانے میں نے کپڑے وغیرہ پہنے اور چلی گئی۔ شیتل کی دکان رادھا بازار اور رگھوناتھ بازار کے سنگم پر تھی جہاں مہابیر جی کا مندر ہے اور لال رنگ بکھرا رہتا ہے اور ہر آتے جاتے کو لگتا ہے۔ کام دھام پر آنے جانے والے لوگ وہاں، تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں، زنجیروں کے ساتھ لٹکی ہوئی گھنٹیوں کو بجاتے ہیں اور چل دیتے ہیں۔ میں جا کر سیتل کی دکان پر کھڑی ہو گئی۔ کئی لڑکے اس کی دکان پر کام کرتے تھے، وہ صرف اپنے بالوں میں کنگھی کرتا تھا اور لڑکوں کو گالیاں دیتا تھا۔

دسہرے کے آس پاس کے دن تھے اور شیتل داس سامنے ٹوکرے میں بانس اور کاغذ رکھے ہوئے تھا۔ میگھ ناد بن چکا تھا، اب راون بنے جا رہا تھا۔

مجھے سامنے دیکھ کر وہ بولا "کیا چاہئے، پھلجھڑیاں"؟
میں نے کہا "پھلجھڑی لینے نہیں آئی، پھلجھڑی دینے آئی ہوں۔"

وہ کچھ نہ سمجھا، دکان سے نیچے اتر آیا۔ میرا تن بدن کانپ اٹھا۔ میں پرے منہ کر کے راون کے ڈھانچے کو دیکھنے لگی جس نے طبیلے کا تین چوتھائی حصہ گھیر رکھا تھا۔ دس سر لگنے والے تھے اور اوپر گدھے کا سر لگنے سے پورا طبیلا گھر سکتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی شیتل کے سر کی طرف دیکھا جس پر ہر سال مٹکیاں پھوڑنے سے چھوٹے چھوٹے گھاؤ کے نشان پڑ گئے تھے۔ پھر مجھے جو کہنا تھا، چپکے سے کہہ دیا۔ شیتل کا اس کا چہرہ چمک اٹھا اور میں چل دی۔

شام کو بھاٹ چلے آئے جو ہر سال ہمارے گھر میں آلہا اُودل سنایا کرتے تھے اور جسے سن کر ہمیں بڑا جوش آتا تھا۔ ان میں سے ایک تھا جو کھنجری بجاتا تھا اور وہ شیتل تھا۔ چوں کہ یہ سب لوگ گھر کے اندر تھے اس لئے رو پوا انہیں دیکھ سکتی تھی۔ شیتل کو دیکھتے ہی وہ کانپنے لگی۔ اس نے میری طرف دیکھا، میں مسکرا دی۔

گھر بھر میں کوئی بھی شیتل کو نہ پہچان سکا، نہ پڑوسنیں اسے جان پائیں۔ کمبخت ایسا بہروپ بنا یا تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ایک پہچانا تو پہچاننے والی نے، جو اس کے ایک ایک بل کو جانتی تھی۔ رو پوا اندر بھاگنے لگی میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

میں کہتی ہوں بالو کی ماں! مجھے اس میں ذرا بھی شرم نہیں لگی اور نہ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کوئی پاپ کیا ہے، الٹا ایسا جان پڑا جیسے کوئی بہت بڑاپن کا کام کر رہی ہوں۔ ہمارے شاستر اِس طرف تھے.. .. اور دَدّا، ساس، جیٹھانی، سسر، جیٹھ، یہ، وہ، سب دوسری طرف .. .. میں نے وقت کا ایسا بندوبست کیا کہ ان کے شروع

کرنے سے ختم کرنے تک رات ہو چکی تھی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ عورتوں میں سے روپو گم ہے اور مردوں میں سے شیتل۔ باقی بھاٹ تلسی جی میں سے کچھ پڑھتے رہے۔۔۔

جب بہت دیر تک نہ آئے تو میں گھبرا گئی۔ اٹھ کر گئی تو دیکھا، روپو اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی چھت کو تاک رہی ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا، وہ کہاں گیا تو روپو نے بتایا، پیچھے سیڑھیوں کے راستے میں غائب ہو گیا ہے۔ میں سمجھی بس مل لئے دونوں، اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ مجھے کیا پتہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔

گھر کے مرد لوگ پیڑھی پر سے چلے آئے۔ میں سچ کہتی ہوں، اس دن مجھے روپو کے کھیا برے نہ لگے۔ انہیں خود بہت تعجب ہوا کہ یہ آج اتنا پھلا کیوں رہی ہے؟ میں بہت خوش تھی، جیسے مجھے کچھ مل گیا ہے۔ مل بھی جاتا تو بالو کی ماں، اپنے آدمی کے لئے میرے دل میں پیار کم ہو جاتا، بالکل نہیں، الٹے بڑھتا ہی۔ میں سوچتی، میں کیا کر آئی ہوں؟ ان بیچاروں کو کیا معلوم؟ جو لوگ عورت کو عورت نہیں سمجھتے، بیوپار جائیداد کی چیز سمجھتے ہیں، جن کے دماغ میں بیاہ کا وہی پرانا دچار گھسا ہوا ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھا، انہیں اس بات کی کیا سمجھ؟

رات دو بجے میں ہڑبڑا کر اٹھی۔ گھر بھر میں شور مچا ہوا تھا۔ روپو شیتل کے ساتھ بھاگ رہی تھی کہ پکڑی گئی۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ روپو سے الٹے سیدھے سوال کئے جا رہے تھے لیکن اس نے ایک ہی چپ لگا رکھی تھی، وہ ڈھیٹ بن گئی تھی۔ اس کے تیور کچھ ایسے تھے کہ کرنا جو میرا کرنا ہے میں تو وہی کروں گی جو میرے دل میں ہے۔۔۔

ایک بات اچھی ہوئی جو شیتل نکل چکا تھا۔ اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہ چلا۔

اب سب کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ اتفاق سے دوسرے ہی دن گھر کے نائی نے بالا گھاٹ میں ایک رشتے کا پتہ دیا۔ ایسے سیٹھ کا پتہ دیا جس کے چھ دیوانے نکل چکے تھے اور جو بتوں کا بیوپار کرتا تھا۔۔۔ سب کچھ جلدی ہی میں طے ہو گیا۔ روپو کو منانے کا کام مجھے سونپا گیا۔ روپو کچھ مانی کچھ نہ مانی اور کچھ دنوں میں برات دروازے پر آ گئی۔۔۔

میں نے لڑکا دیکھا تو میری طبیعت خوش ہو گئی۔ وہ شیتل سے کچھ نہیں تو دس گنا سندر تھا، یہ لمبا چوڑا تندرست۔ میں روپو کے پاس بھاگی گئی اور اسے سب بتا دیا۔ روپو مسکرا دی۔ ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ۔ میں تو ناچ اٹھی۔ جیسے روپو کی نہیں، میری شادی ہونے جا رہی ہے۔

تم نے وہ شادی تو دیکھی ہے، بالو کی ماں، جو دیول نگر میں یادگار رہے گی۔ ان کے پتا نے وہی کیا جو ہماری جات برادری کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک لاکھ روپیہ لگا دیا۔ گھر میں کس نے کس نے نہیں کھایا؟ کون ننگا بھوکا نہیں گیا؟ ہمیں چھیڑنے کو پوری بارات ملی، اور پھر وہ۔۔۔ دولہن کا دولہا! وہ چہل پہل ہوئی، وہ شور مچا کہ بس۔۔۔ بینڈ باجے گانے، روشنیاں، میری جیٹھانی کے بچے خوش تھے۔ میں نے بلرام کو بلایا اور کہا، دیکھ ننھے! تیری بوا کی شادی ہو رہی ہے۔ اس بے چارے کو کیا پتہ، کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا اور کیا ہونے جا رہا ہے، وہ تو خوش تھا ہاتھ میں ایک بڑا سا لڈو تھامے۔ اس نے صرف اتنا کہا: "میں بھی شادی کروں گا چاچی۔"

میں نے کہا "کس سے ؟"

بولا "بوا سے "

"ہشت" دوّا جو پاس کھڑی تھیں، بولیں۔

ڈولی گئی۔ وہ آتشبازی چھوٹی کہ رام رام! پانچ ہزار کا ٹھیکہ میں نے ان سے کہہ سنکے شیتل کو دلوایا تھا اور وہ خود اپنے سامنے چکر چلوا رہا تھا جس میں سے سات رنگ کے پھول نکلتے تھے ۔ ۔۔ ۔۔ پھر ڈولی گئی۔

کہیں مہینے دو مہینے کے بعد روپو آئی۔ اس کے چہرے پر رنگ ہی اور تھا۔ لڑکے نے اُسے اور اس نے لڑکے کو خوب پسند کیا تھا۔ روپو کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے

اب میں اس کے سامنے یہاں کے منکی بھوڑ کا نام بھی لیتی تو روپو خود ہی منہ پر انگلی رکھ لیتی۔ میں نے اس سے کہا "روپو، دیکھا ۔۔ ۔۔ میں نہ کہتی تھی "؟

روپو بولی "اور تو کوئی بات نہیں بھابی، یہ مجھ سے پیار کرتے ہیں، پر دبو بہت ہیں۔ گھر میں کمانے والے میرے سسر ہیں اور ان کے بڑے بھائی۔ اس لئے ہر چھوٹی بڑی بات کے لئے انہیں ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس گھر کے بڑے ہم سے کچھ اور چاہتے ہیں ۔۔ ۔۔ "

"اور وہ تمہارا ۔۔ ۔۔ " میں نے شرارت سے پوچھا۔

"وہ تو کچھ نہیں چاہتے۔ بس ۔۔ ۔۔ " روپو نے کہا اور میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ پھر بولی "بہت وہ کرو گی بھابی تو ماروں گی، ہاں "

میں مارے خوشی کے رو دی. لیکن کیا پتہ تھا ہمیشہ کے لئے رونا پڑ جائے گا۔ ہائے یہ مرد ! . . . روپو چار مہینے سے یہاں ہے اور کوئی لینے والا نہیں آیا۔ وہ روپیہ مانگتے ہیں اور یہ دینے کو تیار نہیں۔ روپو نے ٹھیک ہی کہا تھا لڑکا دبّو ہے۔ بات یہ ہے کہ اچھے روپ جوانی سے کچھ نہیں ہوتا جب تک آدمی آزاد نہ ہو سب بیکار ہے ـــ

ابھی کچھ مہینوں میں روپو آدھی رہ گئی ہے۔ وہ بچاری چھجے سے بھی نیچے نہیں جھانکتی۔ حالانکہ ہر دوسرے تیسرے روز اس دیول نگری کا بانکا، شیتل آتش باز، پیار کے گانے گاتا نکل جاتا ہے۔ کل سویرے میرے سسر آئے۔ بہت خفا معلوم ہوتے تھے۔ اس نائی کو گالیاں دے رہے تھے جس نے یہ رشتہ کرایا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے: "ہم لڑکی کو کبھی نہ بھیجیں گے چاہے وہ ساری عمر یوں ہی بیٹھی رہے۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے، روپو کے سسر کا تو ایک بھی دیوالہ نہیں نکلا ہے . . . !"